امام احمد رضا:

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

انجمن ثنائیہ دار الیتامیٰ، میرا روڈ

بین الاقوامی یک روزہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس منعقدہ ۷؍فروری ۲۰۱۰ کے مقالات کا دلچسپ مجموعہ

امام احمد رضا: ایک نئی تشکیل

ڈاکٹر غلام جابر شمسؔ مصباحی

شعبۂ نشر و اشاعت

انجمن ثنائیہ دار الیتامیٰ، پوجا نگر، میرا روڈ، ضلع: تھانے، مہاراشٹرا

نام کتاب: فکر رضا: ایک نئی تشکیل

تالیف : ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

تصحیح : مولانا مظہر علیمی

کمپوزنگ: محمد ارشاد شیخ نجمی

طباعت : ۲۰۱۱ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : Rs. 100

ناشر : انجمن ثنائیہ دارالیتمیٰ، پوجانگر، میرا روڈ، ضلع: تھانے، مہاراشٹرا

ملنے کے پتے:

- مکتبہ ثنائیہ، پوجانگر، میرا روڈ، مہاراشٹرا
- برکات رضا فاؤنڈیشن، میرا روڈ، مہاراشٹرا
- فیضی کتاب گھر، مہسول چوک، سیتامڑھی، بہار
- رضا دارالقرأت، کچور، وایا بھتی، ضلع: سیتامڑھی، بہار

مشمولات

فہرست

☆ روداد و قرارداد:

انتساب

امام احمد رضا کے پیر خانہ خانقاہِ عالم پناہ مارہرہ مطہرہ کے نام

اور

میر عبد الواحد بلگرامی

میر عبد الجلیل مارہروی

خاتم الاکابر سید آل رسول مارہروی

فیض العارفین سید ابو الحسین نوری مارہروی

سید اسماعیل حسن شاہ جی میاں مارہروی

تاج العلما سید اولاد رسول محمد میاں مارہروی

احسن العلما سید حیدر حسن میاں مارہروی

قدست اسرارہم

کے نام

اور

جامعہ البرکات علی گڑھ کے نام

جس کے روح رواں امین ملت پروفیسر سید شاہ امین میاں اور اشرف ملت سید شاہ محمد اشرف میاں مدظلہما العالی ہیں، جنہوں نے دن کے اجالے میں جماعت اہل سنت کی سربلندی کا خواب دیکھا جس کی حسین تعبیر مجسم شکل میں سرزمین علی گڑھ پر اتر چکی ہے۔

نذر عقیدت

حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ حامد رضا قادری قدس سرہ

کے نام

جنہوں نے دور استعمار میں مسلمانانِ ہند کو استقلال کی زندگی گزارنے کا شعور بخشا۔

تاجدار اہل سنت مفتی اعظم حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ رضا قادری قدس سرہ

کے نام

جن کی ایمانی صلابت نے اسلامیانِ ہند کو حرارت ایمانی کی چاشنی دی۔

ان کے جانشین قاضی القضاۃ فی الہند تاج الشریعہ حضرت مفتی شاہ اختر رضا ازہری میاں

کے نام

جو امام احمد رضا، حجۃ الاسلام، مفتیِ اعظم کے علم و فضل، فکر و دانش، ورع و تقویٰ کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ جن کا وجود خوش فکر مسلمانانِ ہند کے لیے نشانِ افتخار ہے۔ جن کی کتابوں، مقالوں، خطابوں نے عربوں کا ذہن صاف کر دیا ہے۔ جن کی علمی گہرائی، فقہی مہارت، عربی دانی، شعر گوئی، شخصی وجاہت، عملی تقویٰ و طہارت نے ہند کیا، عرب کیا، ساری دنیائے اہل سنت کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

سمینار کا رس

پیش نظر کتاب سمینار کے رس کی صورت میں حاضر خدمت ہے، مغز کے ساتھ پوست، تو ظاہر ہے، ہوتا ہی ہے۔ اول و آخر کی تحریریں وہی پوست ہیں۔ اول میں ''تصور سے تکمیل تک'' اپنی 'سرگزشتِ عزم و جزم' ہے۔ آخر میں 'روداد وقرار داد' ہے۔ جس میں محترم غلام مصطفیٰ رضوی کی ایک، جناب محمد عتیق الرحمٰن کی دو تحریریں ہیں، جو دراصل روداد و رپورٹ ہے۔ قرار داد کے ذیل میں آئندہ کا لائحہ عمل ہے۔ درمیان میں جو مغز ہے، اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں دانشوروں کے پڑھے گئے مقالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں اضافات کے عنوان سے دو تحریریں ہیں، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہہ نہیں سکتا، یہ مجموعہ ہر طرح مکمل ہے۔ عدالت آپ کی، فیصلہ آپ کا، ہاں! بھلا لگے، تو دعائیں دیں کہ دعا ہی مومن کا ہتھیار ہے۔ برا لگے، خامی پائیں، تو اصلاح کریں، کہ قبول اصلاح کے لیے دست بستہ حاضر ہوں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

طالب دعا

غلام جابر شمس مصباحی

بن قاضی عین الدین رشیدی

عفی عنہما

عرض ناشر

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی دینی علمی، شریف، زمیندار خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ پیدا ہوئے، تو منشی قاضی محمد اشفاق، ماموں جان نے غلام جابر نام رکھا۔ تعلیم کی ابتدا اس درسگاہ سے ہوئی، جسے ماں کی گود کہا جاتا ہے۔ اگلا مرحلہ بستی کا مدرسہ تھا، بعد میں یہ تعلیمی سلسلہ مدرسہ اسکول، دارالعلوم، کالج اور یونیورسٹی میں جا کر اختتام کو پہنچا۔ تعلیم کے بعد تدریس کے میدان میں اپنی تدریسی جولانیت دکھانے کا آغاز فرمایا، ملک کی بین الاقوامی شہرت یافتہ درسگاہ مرکز الثقافہ السنیہ کالی کٹ کیرلا میں عرصہ دراز تک تعلیمی و تدریس کا سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رکھا۔ وہاں کے بعد یہ اپنی تحقیقی مہم کو لے کر بمبئی وارد ہوئے۔ میرا روڈ میں قیام کیا، ان کو میں کوئی دس برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تو انہوں نے مواد و کتب کی فراہمی اور مطالعہ و کتب بینی میں اپنے آپ کو مصروف رکھا، یوں تو تحریر و اشاعت سے ان کا تعلق ان کے دورِ طالب علمی سے قائم تھا، مگر پی ایچ ڈی کے دوران جس جنونی کیفیت سے انہوں نے کام کیا وہ آج کی نئی نسل کے لیے نمونہ ہے۔ تدریسی میدان میں کامیاب سفر کے بعد جب انہوں نے تحقیقی سفر شروع کیا تو بلاشبہ تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ ہندو پاک اور بیرونی دنیا میں ان کے تحقیقی ذہن اور خوبصورت اسلوب کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ جہاں مذہبی حلقوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہیں ان کی کتاب 'پرواز خیال' اور 'بولتی تصویر' نے ادبی حلقوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی عزم و لگن کے حد درجہ پکے ہیں۔ جس کام کا ارادہ کر لیتے ہیں، خار دار راہوں سے گزر کر بھی وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی صحبت میں کوئی دس برس سے بیٹھ رہا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک پکے شریعت پسند و صول پسند شخصیت کے مالک ہیں۔ مال و دولت یا مالداروں کے رعب و تمکنت کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ علمائے کرام، مثلاً محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری انہیں اپنے خاص شاگردوں میں شمار کرتے ہیں اور ان کے کاموں پر وہ بے حد ناز کرتے ہیں۔ پروفیسر سید طلحہ برق رضوی، انہیں ایک صوفی منش شخص کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی ڈاکٹر غلام جابر مصباحی کو اقبال کا معنوی شاگرد قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود علیہ الرحمہ ڈاکٹر موصوف کو دورِ حاضر کے جوانوں کے لیے ایک

آئیڈیل قرار گردانتے ہیں۔ اس قسم کے تأثرات اگر دیکھنے ہوں تو ان کی مطبوعہ کتاب 'امام احمد رضا: خطوط کے آئینے میں' ملاحظہ کریں۔ جہاں پچاسوں اہل علم اور علمائے ادب نے ڈاکٹر غلام جابر کی کاوشوں کو سراہا ہے۔

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی جہاں ایک کامیاب مدرس ہیں وہیں ایک مقبول عام محقق و قلم کار بھی ہیں۔ اور یہ بھی بلا تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ حد درجہ ایک اعلیٰ انتظام صلاحیت کے مالک بھی ہیں۔ گزشتہ سال ۲۰۱۰ء میں انہوں نے ایک پروگرام مرتب کیا، جو بین الاقوامی امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کے عنوان سے تھا۔ اس کا سارا کریڈٹ خود ان کے سر جاتا ہے، جب کہ ان کے دو چار احباب ہی ان کے دس و بازو بنے ہوئے تھے۔ اس مثبت، انقلابی اور تاریخ ساز پروگرام کا اثر پوری دنیا میں محسوس کیا گیا، علما و مشائخ اور دانشوروں نے کھل کر ان کی کاوشوں کو دادِ تحسین دی اور دعاؤں سے نوازا۔ پروگرام کے پڑھے گئے مقالات، کو انہوں نے ترتیب دے رکھی تھی، جس کا انہوں نے نام رکھا ہے 'فکر رضا: ایک نئی تشکیل'۔ ایک سال گزر جانے کے باوجود وہ اسے چھپوانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب میں نے ان سے گزارش کی کہ میں اپنی انجمن کی طرف سے اسے شائع کردوں، تو انہوں نے کشادہ قلبی سے اس کی اجازت دے دی۔ اب یہ کتاب انجمن ثنائیہ دارالیتامیٰ نیا نگر میرا روڈ کی طرف سے طبع ہو کر آپ کی خدمت میں پہنچ رہی ہے۔ انجمن ثنائیہ ایک تعلیمی ادارہ ہے، اور اشاعت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ جس کی پہلی اشاعت پیشِ نظر کتاب ہے۔ یوں ہم فروغِ رضویات کی راہ میں حصے دار بن رہے ہیں اور ڈاکٹر موصوف کے بارِ گراں کو ہلکا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ڈاکٹر موصوف یوں ہی دین و ملت کی خوابیدہ صلاحیتوں اور جذبوں کو جگاتے رہیں اور نوجوانوں میں نئے نئے انقلاب برپا کرتے رہیں۔

پیش نظر کتاب کی پروف ریڈنگ بار بار کی گئی ہے۔ اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے، تو نشاندہی فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح ممکن ہو سکے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نیک دعاؤں میں انجمن ثنائیہ دارالیتامیٰ میرا روڈ اور اس کے بانی خاکسار محمد علاء الدین رضوی کو ضرور یاد رکھیں۔

خادم قوم و ملت

محمد علاء الدین قادری رضوی

بانی و مہتمم انجمن ثنائیہ دارالیتامیٰ

نیا نگر میرا روڈ ممبئی

فکر رضا کے نئے زاویئے، نئے آفاق

ہشت پہل شخصیت: علم، عمل، عشق، لکھا گیا ہے اس مثلث کا نام امام احمد رضا ہے۔ یہاں علم، عمل، عشق سے جو مراد ہے، اس سے ہٹ کر ایک مثلث اور ہے، وہ ہے شخصی، گہرائی، فنی گیرائی، فکری رسائی، اب ان کی شخصیت شش جہت بن جاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کیا، انیسویں صدی اور بیسویں صدی کیا، اٹھارہویں صدی سے دو تین صدیوں پہلے تک ایسی شش جہت، ہشت پہل شخصیت کوئی اور نظر نہیں آتی۔ یہ محض ادعا نہیں، حقیقت ہے۔ ابھی یہ حقیقت، عقیدت کے پردۂ زرنگار میں لپٹی ہوئی ہے۔ یہ پردے اٹھنے چاہیئں، پرتیں نکلنی چاہئیں۔ تب وہ ماہ رو، ماہ وش مکمل رونما ہوگی۔ اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تابشوں کا دنیا جلوہ دیکھے گی۔

پسندیدہ موضوع: لیکن چلمن کی اوٹ سے جو شعائیں پھوٹی ہیں، انصاف والی زبانیں، بے ساختہ وہی باتیں کہتی ہیں، جو تمہیدی سطور میں کہی گئی ہیں۔ شواہد کا پیش کرنا، طول مبحث کا باعث ہوگا۔ جنہیں دیکھنا ہو وہ ان سات سو کتابوں کو دیکھیں، جو ان کی سیرت کے زاویوں اور افکار کے آفاق پر لکھی گئی ہیں۔ زیادہ نہیں، تو کم از کم وہ پچاس پچپن مقالات ضرور مطالعہ کرلیں، جو ایم فل، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ کے تھیس کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ جن پر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے ڈگریاں ایوارڈ کی ہیں۔ یہ تحقیقات پچھلے پچیس برسوں کی ہیں۔ اب تو یہ رفتار، رفتار بصر سے بھی زیادہ تیز ہوتی جارہی ہے۔ کیوں کہ عالمی جامعات میں یہی موضوع سب سے زیادہ پسندیدہ، موضوع سمجھا جارہا ہے۔

شخصی گہرائی: اسلامی ہند، برطانوی ہند میں جس کے پاس ایک گاؤں ہوتا تھا وہ زمیندار کہلاتا تھا۔

امام احمد رضا کے آبا واجداد کوئی چودہ گاؤں رکھتے تھے۔ مگر امام احمد رضا کی سیرت زمیندارانہ خوبو، تعیش، تنعُّم سے پاک دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ وہ زمینداری ہی ترک کر چکے تھے۔ یہی نہیں، ان کے گھریلو، خانگی انتظام بھی ان کے بھائی دیکھا کرتے تھے۔ وہ تارک سلطنت تو نہ تھے، کہ سلطنت نہ رکھتے تھے۔ مگر دنیا سے بے نیاز، تارک دنیا ضرور تھے۔ ان کا سارا وقت علمی کام، دینی خدمت، عبادت الٰہی، یادِ رسول میں گزرتا تھا۔ خیر خواہ اُمت اسلامیہ تھے وہ، بہی خواہِ ملت مرحومہ تھے وہ۔

☆ زندگی کے شروع حصہ میں اسلامی حکومت تھی، آخر حصہ میں ریاستیں قائم تھیں، نوابین موجود تھے۔ رہی سہی زمینداریاں بھی بہت تھیں۔ کوئی یہ کہہ نہیں سکتا، کسی بادشاہ، کسی نواب، کسی زمیندار سے امام احمد رضا کا دنیاوی رابطہ رہا ہو۔ غوث پاک، غریب نواز، محبوب الٰہی، قطب الدین کاکی، فرید الدین عطار، فرید الدین گنج شکر کی شفاف سیرت میں جو ہمیں استغنا نظر آتا ہے۔ اقتدار، شاہانِ اقتدار کے تئیں جو للکار سنائی دیتی ہے۔ وہی استغنا امام احمد رضا کی سیرت میں نظر آتا ہے۔ وہی للکار، زبانِ رضا سے سنائی دیتی ہے۔ عباسی خلفا نے منصب قضا کی پیشکش کی تھی امام اعظم نے ٹھکرا دی تھی۔ اس کی تازہ مثال دیکھنی ہے، تو امام احمد رضا کے یہاں دیکھیے۔ نوابوں کے یہاں جاتے، یہ تو دور کی بات ہے۔ وہ آنا چاہتے تو آنے تک نہ دیا۔ نہ صاحبزادوں، شاگردوں کو بھیجا۔ ریاست حیدر آباد کے قاضی القضاۃ کا عہدہ نامنظور کر دیا تھا۔ کیجیے! ذرا ان کی سیرت، سوانح کا مطالعہ تو کیجیے۔

☆ کوئی چودہ برس کی عمر میں نماز فرض ہوئی، پھر وقت وصال تک نہ چھوٹی، فرائض تو پڑھتے ہی تھے، تمام نوافل، تمام مستحب نمازیں، پڑھ ڈالتے تھے۔ گرمی، بارش، جاڑا، کوئی موسم اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ تمام سنن، مستحبات کی ادائیگی کے ساتھ، ہر نماز اپنے وقت پر پڑھ لی جاتی تھی۔ امام کو مرض بھی خوب لگتا تھا۔ حالتِ مرض میں بھی جماعت سے نماز پڑھتے، تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہو پاتی۔ جب ضعف، نقاہت بڑھ جاتی۔ چلنے کی سکت باقی نہ رہتی، تو کبھی دو، کبھی چار آدمی کے سہارے مسجد پہنچتے۔ پھر فرض ادا کرتے۔ فرض کھڑے ہو کر، سنن، نوافل، بیٹھ کر پڑھتے۔ اوراد و وظائف بہر صورت پڑھ لیتے۔ درود کا ورد تو حرز جان ہی تھا۔ فرض روزے، جب سے عائد ہوئے، سفر، حضر، بیماری میں کبھی نہ چھوٹے۔ اخیر عمر میں کمزوری زیادہ تھی۔ دن بڑے تھے، شدید گرمی ہوتی، بریلی میں روزہ رکھنا مشکل معلوم ہوتا، تو کوہ بھوالی، نینی تال چلے جاتے۔ جہاں فضا ٹھنڈ ہوتی، ماحول خوشگوار ہوتا، روزے کے لیے یہ اہتمام ضرور

کرتے، مگر روزہ چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ حج فرض والد کریم کے ہمراہ ادا ہو چکا تھا۔ دوسرا حج اخوان، اولاد، احباب کے ساتھ کیا۔ تمام مناسک شرعاً ادا کیے۔ زکوٰۃ غالباً کبھی نہ دی، کہ مالِ نصاب کبھی پایا ہی نہ گیا۔

☆ آٹھ برس کی عمر میں قلم پکڑا، نعتیں کہیں، مضامین لکھے، کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۴ برس کی سن ہی میں باقاعدہ فتویٰ دیا، وہ بھی علم میراث پر جو علومِ دین میں سخت شعبۂ علم ہے۔ پھر کبھی ان کا قلم رکا، نہ تھکا، کوئی شاخِ علم ایسی نہیں، جس پر ان کا طائرِ قلم نہ چہکا ہو، جو موضوع بھی زیرِ بحث آیا، پامال تو نہ کہوں گا، نہال ہو کر رہ گیا، ان کا طرۂ امتیاز تو علومِ دینی تھا۔ مگر دنیاوی علوم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جس میں ایجاد و ابداع کی حد تک، ان کے جواہر پارے، گوہرے آبدار کی طرح نہ چمکتے ہوں، افتا، جو خصوصی شغف تھا۔ لوگ پوچھتے تھے، فتویٰ کی فیس کیا ہے، یہ پوچھنا ان کے تن بدن میں آگ لگا دیتا تھا۔ فرماتے تھے، کمائی کا یہ صیغہ کن کوتاہ لوگوں نے نکالا ہے، خدا کی پناہ، یہاں فتویٰ فیس لے کر نہیں دیا جاتا، آئندہ ایسی بات پوچھنے کی جرأت ہرگز کوئی نہ کرے، یہ تو خدمت دین، خدمت خلق ہے۔ اجر اللہ عطا فرمائے گا۔ ڈاک خرچ بھی خود ہی لگاتے تھے۔ ایسا نہیں کہ دو چار فتوے ہوتے ہوں، اقطار ہند ہی نہیں، اکناف عالم سے سوالات کا ہجوم رہتا تھا، یہ تعداد کبھی کبھی چار چار سو، کبھی پانچ پانچ سو تک پہنچ جاتی تھی، اندازہ کیجیے، جوابات میں کتنا وقت، ڈاک ٹکٹ پر کتنا پیسہ خرچ ہوتا ہوگا، ایسا پیکر اخلاص مفتی، بے لوث دینی دانشور، بے مفاد خادم شرع، چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید ملے۔

☆ عرفانِ ذات کا اتنا گہرا شعور تھا، لگتا ہے شکم مادر سے ہی لے کر پیدا ہوا ہو، ننھی عمر میں روزہ رکھا، یہ روزہ تادیبی تھا، تشریعی نہیں۔ دن ڈھلے کہا گیا، چھپ کر کچھ کھا پی لے، کوئی نہیں دیکھتا، جواب دیا، کوئی نہیں دیکھتا، ٹھیک ہے مگر خدا تو دیکھ رہا ہے۔ ارشاد حدیث میں عمل کے جس خلوص کو 'احسان' سے تعبیر کیا ہے، اس احسان کا ادراک ان کو اسی ننھی عمر میں حاصل ہو چکا تھا، بائیس برس کی عمر، جو عین شباب کی ہوتی ہے، اس عمر میں رحمت الٰہی کی ورودگاہ، معرفت الٰہی کی آماجگاہ، خانقاہِ عالم پناہ، مارہرہ مطہرہ پہنچا، والدِ کریم ہمراہ تھے، بیعت ہوتے ہی خلافت بھی پائے، خانقاہ کے حاضر باش ذرا چیں بجبیں ہوئے، تو خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول نے جواب دیا، یہ وہ طالب و سالک نہیں، جسے عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ کی بھٹی میں تپایا جائے، بسط و قبض کا درس دیا جائے، اس کا دل پہلے ہی سے مجلیٰ و مصفیٰ ہے۔ اس کی ذات تپ تپا کر کندن بن چکی ہے، یہ شہادت کسی ایسے ویسے کی نہیں، سراج الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی کے

شاگرد ارشد خاتم الاکابر کی ہے۔ بچپن، جوانی میں، تصوف وسلوک، جذب وکیف، لذت وسرشاری کا جب یہ عالم تھا، تو پھر کہولت، ادھیڑ عمر ضعف وپیری میں، کس عالم بالا کی وہ سیر کرتے رہے ہوں گے۔ مثل مشہور ہے 'من عرف نفسه فقد عرف ربه' یہ ہے ان کی شخصی گہرائی کی ایک جھلک۔

فنی گیرائی: تقسیم در تقسیم ہوتے ہوئے، علوم وفنون کی آج جتنی قسمیں بن گئی ہیں، پہلے اتنی قسمیں نہ تھیں، یہ تخصصات کا دور ہے۔ جو ایک شاخِ علم کا شہسوار ہوتا ہے، دوسری شاخ اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے، پہلے آدمی ہمہ داں ہفت خواں، ہر فن مولیٰ ہوتا تھا، کثیر علوم وفنون، شاخوں سمیت، تمام جڑیں مٹھی میں ہوتی تھیں، مابعد کے زمانہ میں یہ خصوصیات آپ اپنے رخصت ہوگئیں، اس علمی کساد بازاری میں، امام احمد رضا نے آنکھیں کھولیں، علوم وفنون کے میدان میں وہ فنی گیرائی حاصل کی کہ علوم وفنون کی ساری دنیا تماشائی بن کر رہ گئی، اس خداداد امتیاز کا اعتراف، ان کے حلیف اور حریف دونوں کو ہے۔ زیادہ نہیں، صرف تین ہی کتاب پڑھ لیجئے، صداقت کی آنکھ محسوس کیجیے، حقیقت کے رخِ تاباں کا نظارہ کیجیے، نام ہے فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں۔ گویا دبستاں کھل گیا، امام احمد رضا: ارباب علم ودانش کی نظر میں۔

☆ علوم قرآن، علوم تفسیر، اصول تفسیر میں، ایک تو ان کا ترجمہ قرآن کنز الایمان ہے، دوسرے کئی رسالہ جات کئی دراسات اور بھی ہیں۔ کوئی رسالہ، کوئی دراسہ، اٹھا کر دیکھ لیجئے، پرانے علوم، پرانے افکار، پرانے اسالیب، پرانے مناہج ومناہیل، پرانے مطالب ومفاہیم کا وہ شافی چشمہ ملے گا جو کہیں اور نہیں ملے گا، اگر صحرا سر کرنے کی ہمت نہیں، تو ایک ہی دفعہ صحیح، کنز الایمان دیکھ لیجئے، ایمان ہی تازہ ہو جائے گا، بہار آشنا ہو جائے گا۔ کنز الایمان کے معاصر دیگر تراجم بھی ہیں، یہ سب بھی دیکھئے، مثلاً مولانا محمود الحسن نے کیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا ہے، ڈپٹی نذیر احمد نے کیا ہے، اخیر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کیا ہے۔ ان تراجم کو پڑھئے، پھر کنز الایمان سے موازنہ کیجیے، مگر جذبات سے نہیں، ٹھنڈے دل، نگاہِ انصاف سے کیجیے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ یہ نہ کہیں رحمتِ الٰہی کی برسات میں بھیگ کر خاص توفیق خدا کی چھاؤں میں بیٹھ کر امام احمد رضا نے ترجمہ کیا ہے، شرعی اصول وادب کا لحاظ، مقامِ توحید ورسالت کا پاس، زبان وبیان کی نفاست، اسالیب ومناہج کی لطافت جو کنز الایمان میں ہے، مذکورہ معاصر تراجم اس وصف سے خالی ہیں، ازہر یونیورسٹی مصر کے استاذ اہلِ حدیث کے نامور عالم ڈاکٹر حسین الوائی جماعت اسلامی پاکستان

کے سابق صدر مولانا کوثر نیازی نے جب مطالعہ کیا تو یہی ریمارک دیا جو چھپ چکا ہے۔

☆ علومِ حدیث، اصولِ حدیث میں ان کی پچاسوں کتابیں ہیں، پچاسوں رسالے ہیں۔ صحاح سنن، مسانید، معاجم، اطراف، ہمالی، مستدرکات، شروحات احادیث میں ارشاد حدیث کے جو مباحث تشریحات، نکات متفرق طور پر نظر آئیں گے، یہ تمام کچھ آپ ان کے یہاں یکجا پالیں گے۔ ارض الحدیث، حجاز اقدس کے علماء مشائخ، محدثین نے جب دیکھا، تو یہی کہا، اور تڑپ کر لکھ دیا، امام احمد رضا رأس المحدثین ہیں۔ جامع الاحادیث کی دس جلدیں، امام احمد رضا اور علم حدیث کی تین جلدیں پڑھنے میں زحمت ہو، تو آپ براہ راست ان کی کتاب 'الفضل الموہبی، منیر العین، الہادی الکاف، شمائل العنبر کا مطالعہ کر لیجئے، یقین ہو جائے گا، آنکھیں کھل جائیں گی، پھر آپ علمائے حرمین کے ہم زبان ہو جائیں گے۔ یارانِ حسد پیشہ کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے، کتابیں مارکیٹ میں دستیاب ہیں، وقت نکال کر پڑھئے تو صحیح، حقیقت کیا ہے، سراب کیا ہے، ذرا چھان پھٹک تو کیجیے۔ علوم فقہ، اصولِ فقہ یہ ان کا خاص میدان تھا۔ فتاویٰ کا مجموعہ 'العطایا النبویہ فی فتاویٰ الرضویہ' جدید تیس جلدوں میں ہے۔ یہ ایک کتاب ہی نہیں، بحرِ ذخار کیا، بحر مواج کیا، لغت کا دامن تنگ ہے۔ ایسا کوئی لفظ ہی نہیں جو اس پر فٹ کیا جائے۔ یہ ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا ہی نہیں، تمام قدیم و جدید انسائیکلوپیڈیا کا جامع بھی ہے، جس میں تمام نئے پرانے، مجموعہ فتاویٰ کا رس تو ہے ہی، بہت کچھ وہ ہے جو فتاویٰ رضویہ ہی کا خاصہ ہے۔ جس نے بھی دیکھا دانتوں تلے انگلی دبا کر بیٹھا رہا۔ آج یہ تمام مکاتب فکر کے دارالافتا، تمام فقہی سیمینار کی ضرورت ہے۔ شدید مخالف کی جب گاڑی پھنستی ہے، تو برملا کہتے ہیں۔ اب، خان صاحب کو لاؤ یعنی فتاویٰ رضویہ دیکھو، یہاں ایک مثال بس ہوگی۔ خان پور بہاول پور پاکستان کے مفتی سراج احمد خان، گروہ دیوبند کے جید عالم وفقیہ مانے جاتے تھے، مسئلہ میراث پر کتاب لکھ رہے تھے، باب المناسخہ میں اٹک گئے، تمام دنیائے دیوبندیت کو چھان مارا، کہیں بھی حل نہ نکل سکا۔ امام احمد رضا سے رجوع کیا ذہن کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مفتی سراج احمد، نہ صرف علماً گرویدہ ہو گئے، دیوبندیت سے تائب ہو کر اعتقاداً بھی فریفتہ ہو گئے۔

☆ فقہی روشن ضمیری، اس کا توکئی صدیوں میں جواب ہی نہیں، چند نظائر ملاحظہ کیجیے: ۱۸۸۴ء میں علمائے دیوبند نے گائے کی قربانی ناجائز کہا تھا، امام احمد رضا نے جائز کہا تھا، شاہ اسماعیل دہلوی نے خدا

کا جھوٹ بولنا ممکن لکھا تھا، جس کی تائید علمائے دیو بند نے ۱۸۹۰ء میں کی تھی۔ علامہ فضل حق خیر آبادی اور امام احمد رضا نے ناممکن بتایا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں حلقۂ دیو بند کے سرحلقہ، مولانا رشید احمد گنگوہی نے ڈاک خانہ کے نظام کو ناجائز لکھا تھا، امام احمد رضا نے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں مولانا گنگوہی نے عید میں معانقہ کو ناجائز بتایا تھا۔ امام احمد رضا نے جائز کہا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں مولانا نے کوّا کھانا حلال لکھا تھا، امام احمد رضا نے حرام کہا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا گنگوہی نے نوٹ کو چیک بتایا تھا، امام احمد رضا نے ثمن اصطلاحی، مالِ متقوم کہا تھا۔ ابوالحسنات مولانا عبدالحی لکھنوی نے چیک ہی کہا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں علمائے فرنگی محل، علمائے دیو بند نے مسجد کی وقف زمین پر، سڑک بنانے کا فتویٰ دیا تھا، امام احمد رضا نے نہ بنانے کا فتویٰ دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں حلقۂ دیو بند کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے شاگرد مولانا حسن نظامی ثانی نے مشائخ کے لیے سجدۂ تعظیمی جائز کہا تھا، امام احمد رضا نے ناجائز لکھا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں علمائے دیو بند نے ہندوستان کو دارالحرب کہا تھا، دیو بند کے شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور بقول بعض امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد دارالحرب پر دھڑا دھڑ فتوے دے رہے تھے۔ دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے، مگر اس طوفانی، ہیجانی حالات میں، امام احمد رضا نے ہندوستان کو دارالاسلام کہا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں تمام علمائے دیو بند، زعمائے ملت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈیرا ڈالے بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے۔ یونیورسٹی بند کرنے کے لیے شدید احتجاج کر رہے تھے۔ یہ امام احمد رضا کی ذات تھی، جو اس شدید احتجاج کے خلاف زیادہ شدت سے احتجاج کی تھی۔

اب یہاں دعوت فکر دینے کی اجازت چاہوں گا۔ معذرت کے ساتھ گزارش ہے کیا آج پیروان گنگوہ و دیو بند نظامِ ڈاک خانہ کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ عید کے موقع پر کیا وہ معانقہ نہیں کرتے، کیا وہ برسرِ عام کوّا کھا کر بتا سکتے ہیں، چھپ کر کھائیں تو الگ بات ہے۔ کیا وہ آج کرنسی نوٹ کو چیک کہنے کی جرأت کر سکیں گے، کیا ان کو بل بوتا ہے، جو آج ہندوستان کو دارالحرب کہہ دیں، کیا وہ علی گڑھ کے معاملے میں اپنے اکابر کے فتوے پر اٹل رہ سکے، کیا وہ آج گائے کی قربانی نہیں کرتے، کیا آج بھی وہ خدا کے جھوٹ کو ممکن بتاتے ہیں، ان تمام امور و معاملات میں، پیروانِ دیو بند و گنگوہ ندوہ و علی گڑھ، امام احمد رضا کے شرعی فیصلوں پر خاموش عمل کر رہے ہیں، اگر نہ کریں تو ہندوستان میں ان کا جینا دوبھر ہو جائے۔ تو جب بات وہی سچ ہے جو امام احمد رضا نے کہی تھی تو اب ہر انصاف پسند مسلمان کو ان سے مطالبہ کرنا

چاہیے، جب وہ ان ساری باتوں کو مان ہی رہے ہیں، تو اس اعتراض کو بھی مان لیجئے، جوانہوں نے علمائے دیوبند کی شرعاً فقہاً کلاماً قابل گرفت عبارتوں پر کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا ہے، تو اسلامی ہند کے درمیان اتفاق کی راہ آنِ واحد میں ہموار ہوسکتی ہے۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی
پرنسپل حاجی سعید احمد سردار
آرٹس اینڈ کامرس کالج، دھولیہ
سابق پرنسپل سٹی کالج، مالیگاؤں

امام احمد رضا: مجدد علم معاشیات

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید وفرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

☆ ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی سودا تمھاری باہمی رضامندی کا ہو۔'' (سورۃ النساء:۹۹، کنزالایمان)

☆ ''اور فضول نہ اڑا۔ بے شک اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔'' (بنی اسرائیل:۲۶۔۲۷، کنزالایمان)

☆ ''اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں اور گردنیں چھڑانے میں۔'' (سورۃ البقرہ:۱۷۷، کنزالایمان)

☆ ''وہ جو سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن نہ کھڑا ہوں گے، مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے، وہ جسے آسیب نے چھوکر مخبوط بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود، تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا، تو اسے حلال ہے، جو پہلے لے چکا اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے اور جو اب ایسی حرکت کرے گا، وہ تو دوزخی ہے، وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔ اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں کوئی ناشکرا بڑا گنہگار۔'' (سورۃ البقرہ:۲۷۴۔۲۷۵، کنزالایمان)

☆ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا سود اگر مسلمان ہو۔ (سورۃ البقرہ:۲۷۷)

☆ ''پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کرلو، اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ، نہ تمھیں نقصان ہو۔'' (سورۃ البقرہ:۲۷۸)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ فرمایا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ: ''بسا اوقات فقر و احتیاج کفر کا سبب ہوتا ہے۔'' اسی طرح حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے مطابق حضور یہ دعا فرماتے تھے کہ ''اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کفر سے اور فقر سے۔'' (نسائی)

چنانچہ شریعت اسلامیہ نے سود اور فضول خرچی سے بچنے، اپنا عزیز مال مستحقین پر صرف کرنے اور فقر و احتیاج سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی ہے۔

آج بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی حالت عمومی طور پر اطمینان بخش نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر ہندوستانی مسلمانوں کی مالی حالت تشویشناک حد تک کمزور ہے۔ آزادی کے بعد سے جہاں عام ہندوستانیوں کی مالی حالت میں خاطر خواہ حد تک سدھار ہوئی ہے (حتیٰ کہ پسماندہ ذاتیں بھی ملک کی معاشی ترقی سے فیضیاب ہوئی ہیں) وہیں مسلمان معاشی ترقی کے میدان میں جہاں کھڑے تھے یا تو وہ وہیں ہیں یا پھر اور پیچھے ہو گئے ہیں۔ دانشورانِ ملت نے مسلمانوں کی اس تشویشناک حالت پر وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال کیا ہے۔ پچھلے دنوں حکومت ہند نے مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی اور سماجی حالات کا جائزہ لینے کے لیے سچر کمیٹی تشکیل دی تھی۔ میری رائے کے مطابق سچر کمیٹی نے اس ضمن میں اپنی جو رپورٹ پیش کی ہے، اس نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی ہے۔ اس کمیٹی نے تو صرف ان باتوں پر مہر توثیق ثبت کی ہے، جن کا اظہار دانشورانِ ملت اب تک کرتے آرہے تھے۔

سچر کمیٹی کے مطابق شہروں میں عمومی غربت کا شکار 22.8% لوگ ہیں، جب کہ مسلمانوں کا تناسب 38.4% ہے۔ دیگر اقلیتوں کا تناسب صرف 12.2% ہے۔ دیہاتوں میں 22.7% لوگ اسی عمومی غربت کا شکار ہیں جب کہ 26.9% مسلمان اور 14.3% دیگر اقلیتیں غربت کا شکار ہیں۔ رپورٹ کے مطابق شہری مسلمانوں کے مقابلے میں دیہی مسلمانوں کی مالی حالت قدرے بہتر ہے، لیکن غربت کے اس پورے کینوس پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو یہ عُقدہ کھلتا ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ علاوہ ازیں سطحِ صرف (Consumption Level) کو سامنے رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو مسلمانوں کی حالت SC/ST سے کچھ ہی بہتر ہے۔ نیز تقریباً 75 فیصد مسلمان خطِ غربت سے نیچے ہیں۔

سچر کمیٹی کے مطابق تنخواہ والی ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب SC/ST سے بھی کم ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر تو پرائیویٹ سیکٹر ہے، پبلک سیکٹر میں بھی مسلم ملازمت کا تناسب حد درجہ کم ہے۔ روزگار میں اگر مسلمان کہیں نظر آتے ہیں تو خود روزگار (Self Employment) میں ہی نظر آتے ہیں۔

سچر کمیٹی نے مسلمانوں کا تعلیمی محاذ پر بھی جائزہ لیا ہے۔ ہندوؤں میں 80.5% لوگ خواندہ ہیں، مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں میں خواندگی کی شرح 75.2% ہے جب کہ 59.9% مسلمان خواندہ ہیں۔ گویا کہ شرح خواندگی میں بھی مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ علاوہ ازیں سچر کمیٹی کے مطابق مسلم بچوں کا 25% حصہ یا تو اسکول جاتا ہی نہیں ہے یا اگر جاتا ہے، تو بہت جلد اسکول جانا ترک کر دیتا ہے۔ ملک کی کسی بھی قوم کے مقابلے میں مسلم بچوں کے Drop-out (اسکول جانا ترک کر دینا) کی شرح سب سے زیادہ ہے، جیسے جیسے مسلم طلبہ پرائمری سے کالج لیول تک جاتے ہیں، بڑی تیزی سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ (سچر کمیٹی کے مطابق) گریجویشن لیول تک پہنچتے پہنچتے مسلم طلبہ کی تعداد ۲۵/ میں ایک اور پوسٹ گریجویشن تک ۵۰/ میں ایک رہ جاتی ہے۔ مسلم گریجویٹس میں بے کاری کا تناسب بھی سب سے زیادہ ہے۔ سچر کمیٹی نے مدرسہ جانے والے طلبہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس کے مطابق کل مسلم آبادی کا صرف تین فیصد حصہ دینی تعلیم حاصل کر پاتا ہے۔

امتیاز مرچنٹ (اسلامی تجارۃ ریسرچ ٹیم ممبئی) یکم جنوری ۲۰۱۰ء کے روزنامہ انقلاب (ممبئی) کے شمارے میں ''مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی: ایک لمحۂ فکریہ'' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں Companion of light house for science of Islamic Law-Libya نیز Evengalization (انجیل کے مبلغ) اور Chritianisation (اصطباغِ مسیحی) کے موضوع کے ماہر جناب احمد القطانی کے الجزائر ٹی وی کو دیئے گئے ایک انٹرویو کے مطابق عیسائی مشنریاں جہالت، غربت اور انسانی دوسری مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ موصوف کے مطابق ہر گھنٹے میں ۶۷/ مسلمان عیسائیت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، (اس میں کتنی صداقت ہے یہ امر تحقیق طلب ہے، البتہ اطلاع لائق تشویش ہے) ایسے فقر سے اللہ ہر مسلمان کو بچائے۔ آمین۔

امتیاز مرچنٹ صاحب مزید رقم طراز ہیں کہ تقسیم ہند سے مسلمانانِ ہند کی اقتصادی زبوں حالی شروع ہوئی۔ خطِ افلاس کے نیچے زندگی گزارنے والے مسلمانوں کو صحیح ڈھنگ سے راشن نہیں ملتے۔ Subsidy کے ساتھ قرض حاصل کرنے والے مسلمانوں کی تعداد محض 3.2% ہے Govt. Subsidy Food Programme سے فائدہ اٹھانے والے مسلمان صرف 2.9% ہیں، 12% مسلمان سڑکوں پر (خوانچہ لگا کر) مال بیچتے ہیں، جن کا قومی اوسط 8% ہے۔ شعبۂ دفاع میں مسلمان محض 4% ہیں۔ 71% مسلمانوں کو کوئی اقتصادی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ یہ ہیں مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کی چند مثالیں، لہٰذا سب سے پہلے مسلمانوں میں معاشی بیداری پیدا کرنی ہوگی...... آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

اس غربت کے بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں، جن کی وضاحت اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ بہر حال غربت کی ایک وجہ اختصار کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ: ''مسلمان غریب ہیں کیوں کہ یہ غریب ہے۔'' (Muslims are poor because they are poor) یہ غریب ہیں ان کی آمدنی کم ہے ان کا گزر بسر کرنا ہی ان کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے یہ کچھ پس انداز Saving بھی نہیں کر پاتے۔ پیسہ پیسہ پیدا کرتا ہے۔ (Money begets money) آمدنی میں سے کچھ پیسہ بچتا ہی نہیں ہے، اس لیے کوئی کاروبار بھی نہیں کر پاتے تا کہ مزید کچھ کما سکیں۔ آمدنی تو بڑھتی نہیں ہے، ہاں! اخراجات کسی نہ کسی وجہ سے بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ایک عام مسلمان غریب پیدا ہوتا ہے اور غریب ہی مر جاتا ہے۔ غربت کا (بظاہر) یہ نا ختم ہونے والا چکر ہے۔ (Vicious circle of poverty) نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ باپ غریب تھا، بیٹا غریب ہے، پوتا بھی غریب ہی رہے گا۔ ہندوستان میں مسلم مملکتوں کے خاتمے اور انگریزی دورِ حکومت کے آغاز سے غربت کا یہ کبھی بھی نہ ختم ہونے والا چکر جاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آگے بھی جاری رہے گا، (بہر حال اللہ کی رحمت سے مسلمان مایوس نہیں ہوتا)۔

انگریزی دورِ حکومت میں معاشی نکاسی Economic Drain بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ نتیجتاً سونے کی چڑیا جیسا یہ ملک کنگال ہو گیا۔ یہاں پر بسنے والے لوگ کنگال ہو گئے، لیکن ان میں سب سے زیادہ مار پڑی مسلمانوں پر...... ایسا نہیں کہ اُس زمانے میں ملت کا درد رکھنے

والے دانشور نہیں تھے، ان کی ایک طویل فہرست دی جا سکتی ہے۔ان میں زیادہ معروف لوگوں میں مولوی رشید احمد گنگوہی، سر سید احمد خان، مولوی ابوالکلام آزاد، مولوی محمد حسین مدنی......اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں نور اللہ مرقدہٗ تھے۔ میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن سوائے اعلیٰ حضرت کے کسی کے یہاں علم معاشیات سے مربوط کوئی جامع اور مجددانہ تحریر نظر نہیں آتی اور اگر اعلیٰ حضرت کے ہم عصروں نے کہیں کچھ لکھا بھی ہے، تو ان کی تحریر یا تو نامکمل ہے یا پھر نا قابل قبول۔

اعلیٰ حضرت نے علم معاشیات پر جب جب بھی قلم اٹھایا ہے، اپنے زمانے سے آپ بہت بہت آگے نظر آتے ہیں۔اس زمانے کی آپ کی تحریریں مستقبل میں ترتیب دیئے گئے ''علم معاشیات'' کے اصولوں پر کھری اترتی نظر آتی ہیں۔علم معاشیات پر آپ کی تحریروں کی جامعیت آپ کے مجددانہ وصف کی غماز ہیں۔ میرا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔آئندہ سطور میں اس کی وضاحت ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔

اعلیٰ حضرت نے علم معاشیات کے جن عنوانات پر قلم اٹھایا ہے، آیئے پہلے اس فہرست پر ایک نظر ڈال لی جائے مثلاً: (۱) احکام الاحکام فی التناول من یدمَن مالہ حرام (اس تحریر میں مال حرام کے ساتھ معاملات اور ان کے نقصانات کی تفصیل ہے) (۲) افصح البیان فی حکم مزارع ہندوستان (ہندستانی زمین) کی بیدار (پیداوار) پر شرعی وظیفہ کیا ہے۔(۳) کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم (جس میں کرنسی نوٹ کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے) (۴) خیر الآمال فی حکم الکسب والسوال (روزی کمانے، معاش کے حاصل کرنے اور سوال کرنے کے احکام کا ذکر ہے) (۵) ''سود ایک بدترین جرم'' نامی کتاب میں اعلیٰ حضرت کے افادات (فرمودات) کو یکجا کیا گیا ہے۔(۶) المنیٰ والدرر لمن عمد منی آرڈر (اس مضمون میں تجارتی و بنکاری نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے)

ان تحریرات میں شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے عصری مسائل کا حل پیش کرنا اعلیٰ حضرت جیسے ''مجدد عصر'' سے ہی ممکن ہے۔

شریعت کا تھوڑا سا بھی علم رکھنے والا ایسا کون مسلمان ہے، جو سود کی حرمت سے ناواقف ہے۔قرآن وحدیث میں سود کی حرمت کے واضح احکامات جابجا نظر آتے ہیں۔اعلیٰ حضرت نے بھی اپنے فتوؤں میں سود کو بالکل صاف صاف حرام قرار دیا ہے۔اپنے ایک فتویٰ میں آپ تحریر

فرماتے ہیں کہ پانچ سو روپے پر پچیس روپے سالانہ زائد لگانا حقیقی سود ہے۔ آپ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں سودی لین دین کو قطعی حرام فرمایا ہے، نیز اس پر وعیدوں کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ شریعت نے قرض دار سے اصل زر سے زائد رقم وصول کرنے کو سود قرار دے کر اس سے بچنے کی تاکید کی ہے، لیکن سود سے بچتے ہوئے زیادہ لیں اور سود بھی نہ ہو، یہ راستہ ایک مجدد دین ہی بتا سکتا ہے۔ حیلۂ شرعی کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کی یہ تحریر پڑھئے اور داد دیجئے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ایک شخص کے دوسرے پر دس روپے آتے تھے، اس نے یہ چاہا کہ دس کے تیرہ کر لوں، ایک میعاد تک۔ علما نے فرمایا کہ وہ مدیون سے ان دس کے عوض کوئی چیز خرید لے اور اس پر قبضہ کر لے، پھر وہی چیز اس مدیون کے ہاتھ سال بھر کے وعدے پر ۱۳ر کی بیچ ڈالے، تو حرام سے بچ جائے گا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے (اجازت دی ہے)...... (بحوالہ قاضی خاں ۲/ ۶-۴ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ)...... اسی طرح بحر الرائق نے بحوالہ خلاصہ نوازل امام فقیہہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ سے مروی (ص ۶۸-۶۹، اردو ترجمہ) ہے کہ اس طرح کے حیلے کو حضرت امام محمد علیہ الرحمہ نے بیع عینیہ کا نام دیا ہے اور حضرت امام ابو یوسف نے عینیہ کو جائز قرار دیا ہے اور اس پر ثواب بھی بتایا کہ یہ سود (حرام) سے بھاگنا ہے۔'' اب اگر مسلم بنک قائم کر کے اور کھاتے داروں کی جمع کردہ رقم پر اعلیٰ حضرت کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کر کے شرعی حیلوں سے زیادہ رقم دی جائے، تو جائز ہے۔

ایک دوسرے فتویٰ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ''نوٹ کی بیع کم یا زیادہ جائز ہے''...... ہاں نوٹ پر جتنی رقم لکھی ہے، اس سے زیادہ یا کم کو جتنے پر رضامندی ہو جائے، اس کا بیچنا جائز ہے۔

مزید ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ایک روپیہ، ایک اشرفی کو بلکہ ہزار اشرفیوں کو بیچنا جائز ہے'' آج بھی سعودی عربیہ میں ہندوستانی حجاجِ کرام روپئے سے ریال خریدتے ہیں، جس کی شرح ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت اور ہر بازار میں یکساں رہے۔

کرنسی نوٹ کے بارے میں مجددِ عصر اعلیٰ حضرت کے اس Approach کو ملاحظہ فرمائیں، جس نے ملت کی ایک بڑی تعداد کو آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ وظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

حرم شریف کے حنفی امام شیخ عبداللہ مرداد بن شیخ الخطبا شیخ احمد ابوالخیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس وقت ایک سوالنامہ پیش کیا تھا، جب آپ دوسری بار حج کے لیے حرمین شریفین پہونچے تھے اور آپ کے پاس حوالوں کے لیے کوئی کتاب بھی نہیں تھی۔ سائل (علیہ الرحمہ) کا پہلا سوال تھا کہ کیا نوٹ مال ہے یا رسید؟

اعلیٰ حضرت کا جواب تھا، نوٹ قیمتی مال ہے، رسید نہیں۔ (یہ دستاویز کی طرح کوئی سند بھی نہیں ہے۔) آپ نے درج ذیل وجوہ کی بنا پر اسے قیمتی مال قرار دیا۔

(۱) لوگ اس میں رغبت رکھتے ہیں، کیوں کہ یہ بذاتِ خود ایک قیمت رکھتا ہے۔ (۲) وقت حاجت کے لیے اٹھا رکھنے کا یہ زیادہ لائق ہے۔ ضرورت کے وقت اس سے نفع حاصل کرنے کے لیے اسے اٹھا رکھا جا سکتا ہے۔ نیز (۳) یہ بکتا ہے اور اسے مول لیا جاتا ہے۔ (۴) اسے ہبہ کیا جاتا ہے اور وراثت میں بھی آتا ہے۔ (۵) اور جتنی باتیں مال میں جاری ہیں، سب اس میں جاری ہوتی ہیں۔

سائل (علیہ الرحمہ) نے کل بارہ سوالات ترتیب دیے تھے۔ جن میں سوال نمبر ا ربنیادی سوال تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ نوٹ قیمتی مال ہے رسید نہیں۔ فتح القدیر کے حوالے سے آپ نے تحریر فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایک کاغذ ہزار (روپئے مثلاً) کے بدلے بیچے، تو بلا کراہت جائز ہے۔ یہ نوٹ کی ایجاد سے پہلے نوٹ کے بارے میں ایک جزئیہ تھا۔

سائل کا ایک سوال تھا (سوال نمبر ۶) کیا اسے (کرنسی نوٹ کو) درہموں، دیناروں اور پیسے کے ساتھ بیچنا جائز ہے؟ آپ کا جواب تھا، ہاں جائز ہے، جیسے عام شہروں میں لوگوں کے درمیان معمول ہے۔

سوال نمبر ۸: کیا اسے قرض میں دینا جائز ہے اور اگر جائز ہے تو اس کے مثل کے ساتھ ادائیگی ہوگی یا دراہم کے ساتھ؟

جواب: ہاں اسے بطور قرض دینا جائز ہے اور ادائیگی صرف اس کے مثل سے ہوگی۔

سوال نمبر ۹: کیا اسے بطور ادھار مقررہ مدت تک درہموں کے بدلے بیچنا جائز ہے؟

جواب: ہاں! جائز ہے، بشرطیکہ مجلس میں نوٹ پر قبضہ کرے، تاکہ دَین کے بدلے دَین نہ ہو۔

سوال نمبر ۱۰: کیا اس میں بیع سلم جائز ہے، مثلاً ایسے نوٹ کے بدلے جس کی نوع اور صفت معلوم ہو، ایک مہینہ پیشگی درہم ادا کرے؟

جواب: ہاں! نوٹ میں بیع سلم جائز ہے۔

سوال نمبر ۱۱: کیا نوٹ میں لکھی ہوئی روپوں کی تعداد سے زائد کے بدلے میں اس کی بیع جائز ہے، مثلاً دس کا نوٹ بارہ یا بیس یا اس سے کم کے ساتھ بیچنا کیسا ہے؟

جواب: ہاں! اس سے کم یا زیادہ کے ساتھ جس طرح دونوں فریق راضی ہوں سودا کرنا جائز ہے۔

سوال نمبر ۱۲: اگر یہ جائز ہے، تو کیا یہ بھی جائز ہے کہ زید عمرو سے دس روپئے بطور قرض لینا چاہے تو عمرو کہے میرے پاس درہم نہیں البتہ دس کا نوٹ تم پر بارہ روپئے میں بیچتا ہوں تم ہر مہینے ایک روپیہ ادا کرتے رہنا؟ کیا اسے سود کا حیلہ سمجھتے ہوئے اس سے روکا نہیں جائے گا اور اگر روکا نہ جائے، تو اس میں اور سود میں کیا فرق ہے کہ یہ حلال اور (وہ) حرام حالانکہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے یعنی زائد مال وصول کرنا؟

جواب: ہاں! جائز ہے۔ اگر واقعی سودے کی نیت کرے قرض کی نہیں اگر قرض ہوگا تو حرام اور سود ہوگا کیوں کہ یہ ایسا قرض ہے جس کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

حرمین شریفین سے جب آپ وطن لوٹے، تو معلوم ہوا کہ علمائے دیوبند میں مولوی رشید احمد گنگوہی نے فتویٰ دیا ہے کہ نوٹ چیک ہے، انھیں ان کے مثل کے ساتھ بھی بیچا نہیں جاسکتا، چہ جائیکہ کم یا زیادہ رقم کے ساتھ سودا کیا جائے۔ آپ نے ۱۸ / وجوہ سے ان کا رد کیا۔

مشہور عالم دین علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے فتویٰ دیا کہ نوٹ کو اس سے کم یا زیادہ رقم کے بدلے نہیں بیچا جاسکتا۔ آپ نے پندرہ وجوہ سے اس کا رد کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے رشید احمد گنگوہی اور علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی صاحبان کے فتوؤں کو رد فرمایا ہے۔ آپ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ جب کہ ان دونوں صاحبان نے عدم جواز کا، اس اختلاف کے سبب کو سمجھنے اور علم معاشیات کی رو سے کون حق پر ہے، اس کو سمجھنے کے لیے کرنسی نوٹ کے ارتقا کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

کرنسی نوٹ کوئی ایک اچانک وجود میں آنے والا Financial Instrument نہیں ہے۔ ابتدائی کرنسی نوٹ سے لے کر آج کی کرنسی نوٹ تک یہ کئی مرحلوں سے گزری ہے۔ آیئے اس کے مرحلہ وار ارتقائی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں۔

پہلا مرحلہ: سترہویں صدی عیسوی کے وسط کی بات ہے، لندن کے لومبارڈس اسٹریٹ میں

لومبارڈس (تاجر) ایک بنچ پر بیٹھ کر قرض کے لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ یہودی تھے۔ جہاں لوگوں کو یہ قرض دیتے، وہیں لوگوں سے وہ قیمتی اشیا (Valuable) مثلاً سونا، چاندی وغیرہ اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لیے (Safe Keeping) رکھ لیا کرتے تھے، جس کے عوض وہ اتنی ہی قیمت کی رسید (Receipt) دیا کرتے تھے، جس پر I promise to pay the bearer the sum of ...... درج ہوتا تھا، یہ جملہ آج بھی کرنسی نوٹ پر تحریر ہوتا ہے۔ سونا چاندی وغیرہ محفوظ رکھنے والے شخص (Depositor) کو جو رسید ملتی تھی، اس رسید کو واپس کر کے کبھی بھی وہ اپنی قیمتی چیزیں یا رقم واپس لینے کا مجاز تھا۔ اس واپسی کے وقت اسے سروس چارج کے نام پر کچھ رقم لومبارڈ کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس وقت جتنی مالیت کا سونا چاندی وغیرہ لومبارڈ کو ملتا تھا، اتنی ہی مالیت کی رسید وہ جاری کرتا تھا، گویا کہ ہر رسید کے پیچھے سو فیصد Backing ہوتی تھی۔

شروع میں اس کاروبار میں صرف لومبارڈس (مرچنٹس) ہی شریک ہوتے تھے، جلد یا بدیر ان کے ساتھ سنار (Gold Smith) اور دوسرے Money Lenders بھی شامل ہو گئے۔ اس طرح سے یہ ایک اچھا خاصا کاروبار بن گیا۔...... اس مرحلے تک Deposit کے عوض دی گئی کاغذ کی پرچی رسید (Receipt) ہی تھی۔

دوسرا مرحلہ: اس مرحلے میں Deposit جمع کرنے والوں نے محسوس کیا کہ ہر Depositor ہر وقت رسید دے کر اپنا Deposit واپس نہیں لے جاتا ہے۔ مشکل سے ۲-۴-۵ فیصد Depositors ہی اپنا Deposit واپس لے جاتے ہیں اور باقی قیمتی اشیا ویسے ہی پڑی رہ جاتی ہیں۔ اس وقت تک یہ رسید معیشت میں اپنا ایک اعتبار قائم کر چکی تھی۔ اسی اعتبار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرنسی نوٹ جاری کرنے والوں نے بغیر ڈپازٹ کے بھی رسیدیں جاری کرنا شروع کر دیں۔ ابتدا میں یہ رسیدیں گارنمینٹ بانڈس کے خریدنے پر نہایت رازداری کے ساتھ استعمال میں لائی جانے لگیں، جس پر انھیں حکومت سے سود ملتا تھا۔ اس طرح ان لوگوں نے کچھ نہیں پر بھی کچھ کمانا (Earning something for nothing) شروع کر دیا۔ یہ کاروبار کافی منافع بخش ثابت ہوا، چنانچہ Depositors کو اپنی جانب کھینچنے کے لیے انھوں نے سروس چارج کم کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ سروس چارج صفر ہو گیا۔ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی،

بلکہ سروس چارج وصول کرنے والے یہ مرچنٹس (وغیرہ) Depositors کو کچھ سود ادا کرنا شروع کر دیئے۔

المختصر یہ کہ دوسرے مرحلے میں کرنسی نوٹ زائد از ڈپازٹ جاری ہونا شروع ہو گئی۔ اس لیے اب سو فیصدی Backing نہیں رہ گئی، تو اب یہ رسید کہاں رہ گئی۔؟

تیسرا مرحلہ: مرچنٹس (وغیرہ) کی رازداری کا یہ کھیل زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا۔ آخر کار بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ Depositors حیران و پریشان اپنی اپنی کرنسی نوٹ کے ساتھ مرچنٹس کو گھیر لیے، چوں کہ Deposits سے زیادہ کرنسی نوٹ بازار میں تھیں، اس لیے کچھ Depositors کو تو ان کے Valuables مل گئے، باقی لوگوں کو کچھ نہ ملا چنانچہ ان کا نقصان ہو گیا۔ حکومت کے کان کھڑے ہو گئے۔ اب تک اس بازار میں اس کی کوئی مداخلت نہیں تھی۔ جب Depositors کا نقصان بار بار ہونے لگا، تو مفادِ عامہ کے تحفظ میں حکومت نے مرچنٹس (وغیرہ) کے ایک گروپ (Guilds) کو کرنسی نوٹ جاری کرنے کا اختیار دیا۔ Guilds نے کاروبار کے استحکام کے لیے کرنسی نوٹ کو کل Deposits سے ایک نسبت کے تحت باندھ دیا، جسے محفوظ ضرورت (.Reserve Requirement (R.R کا نام دیا گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ میں Guilds نے بھی اپنی انھیں مفاد پرستانہ حرکت (Earning something for nothing) کے سبب عوام میں اپنا اعتبار کھو دیا۔

چوتھا مرحلہ: Guilds نے بھی جب اپنا اعتبار کھو دیا، تو حکومت نے کرنسی نوٹ جاری کرنے کا یہ اختیار Commercial Banks کو دے دیا۔ اسی دوران سینٹرل بینک بھی وجود میں آچکی تھی۔ حکومت نے Reserve Requirement کے تعین کا اختیار سینٹرل بینک کو تفویض کر دیا۔ اب یہ Reserve Requirement اپنی شکل تبدیل کر کے Legal Reserve Requirement (LRR) (قانونی محفوظ ضرورت) بن گیا۔ مثلاً اگر LRR، 10% ہے، تو Commercial Banks کے لیے لازمی ہو گیا کہ اگر اس کے پاس 1000 کا سونا بطور ڈپازٹ آتا ہے، تو وہ کرنسی نوٹ 10000 تک ہی جاری کر سکتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ LRR کا تعین سینٹرل بینک برسوں کے اس تجربے کے بعد کرنے لگی کہ تمام Depositors اب بھی مرچنٹس (وغیرہ) سے اپنا کل Deposit واپس نہیں لیتے ہیں۔ کہیں

سے مشکل سے دس فیصد ہی Deposit واپس لیا جاتا ہے، کیوں کہ لوگ اپنا Deposit اس وقت واپس لیتے تھے، جب انھیں کسی دور کے بازار سے سامان خریدنا ہوتا تھا، جہاں ان کی یہ کرنسی ناقابل قبول تھی۔ کچھ لوگ زیور وغیرہ بنانے کے لیے اپنا ڈپازٹ واپس لیتے تھے، بلاوجہ ڈپازٹ واپس لینے والے آٹے میں نمک کے برابر ہی تھے،لیکن اسی دوران ڈپازٹ لاکر جمع کرنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اس لیے عموماً مرچنٹس (وغیرہ) کے پاس Total Depost کم نہیں ہوتا تھا، بلکہ اکثر بڑھ بھی جاتا تھا۔

ایک اور سبب سے Total Deposit بحال رہتا تھا یا بڑھتا رہتا تھا۔ وہ سبب ہے ملنے والے سود کی شکل میں Depositors کا فائدہ۔ کرنسی نوٹ کے پہلے مرحلے میں ہم نے دیکھا ہے کہ Depositors سے سروس چارج کے نام پر مرچنٹس (وغیرہ) کچھ رقم وصول کرتے تھے۔ اب الٹا یہ لوگ Depositors کو سود دینا شروع کردیئے۔ اس لیے آمدنی میں سے پس انداز کی گئی رقم گھر پر (جہاں وہ محفوظ نہیں تھی) رکھنے کے بجائے وہ لوگ مرچنٹس (وغیرہ) پھر Guilds اور اس کے بعد کمرشیل بینک کے پاس رکھنے لگے۔

پانچواں مرحلہ: پہلے مرحلے میں کرنسی نوٹ صد فیصد Convertible تھی، بعد میں مرحلہ وار یہ Convertibility کم سے کم تر ہوتی گئی اور آج یہ پوزیشن ہے کہ اگر آپ کسی بینک میں ایک ہزار روپئے کا نوٹ لے کر جائیں (جس پر یہ تحریر ہے کہ I Promise to pay the bearer the sum of Rs. 1000 اور اس سے سونا حاصل کرنا چاہیں، تو بینک کے لیے اب یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو سونا دے ہی دے۔ بہت ہوگا تو یہ بینک یا تو Rs.500-500 کے دو نوٹ دے دے یا Rs.100-100 کے دس نوٹ دے دے (وغیرہ وغیرہ) جن پر وہی جملہ لکھا ہوا آپ پڑھیں گے کہ I promise to pay the bearer the sum of Rs. ..... وہ دن اب ہوا ہوئے جب کرنسی نوٹ کے بدلے آپ کو سونا بینک سے مل جاتا تھا، کیوں کہ اس وقت آپ کی کرنسی نوٹ صد فیصد Convertible تھی۔ آج یہ صد فیصد Inconvertible ہے۔

فی زمانہ LRR کے کم ہو جانے اور کرنسی نوٹ کے Inconvertible ہو جانے کے باوجود کرنسی نوٹ Generally Acceptable (عمومی طور پر قابل قبول) ہے، بعض

غریب ممالک میں تو سونا، چاندی زرِ مبادلہ جو کرنسی نوٹ کی Backing کے لیے آج ضروری سمجھے جاتے ہیں، ان کا خاطر خواہ اسٹاک بھی نہیں ہے۔ ایسے ممالک میں ملک کی زمین بطور Backing رکھی جاتی ہے۔ یہ کرنسی نوٹ بھی Inconvertible ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کرنسی نوٹ دے کر ایک قطعہ زمین خریدتے ہیں، تو یہ قطعہ آپ کی ملکیت میں ہونے کے باوجود ملک کی ہی ملکیت میں رہے گا۔ کرنسی نوٹ کی ان تمام خصوصیتوں کے باوجود اسے قبول عام حاصل ہے، اس لیے کہ اسے چاہے سونا چاندی جیسی قیمتی چیزوں کی Backing ملے نہ ملے اب ملک کا قانون اس کی Backing کرنے لگا ہے۔ اس کرنسی نوٹ کو قبول کرنے سے اگر کوئی انکار کرتا ہے، تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ کرنسی نوٹ کی اس خصوصیت نے اسے Legal Tender بنا دیا ہے۔

کرنسی نوٹ پر امام احمد رضا کی تحریر ۱۹۱۲ء/ ۱۳۳۱ھ کی ہے، جب کرنسی نوٹ صد فیصد Convertibility کے مرحلے سے نکل کر سوفی صد سے کم Convertibility کی جانب اپنا سفر کرنا شروع کر چکی تھی، یہ وہ زمانہ تھا، جب RR سوفی صد نہیں رہ گیا تھا، بلکہ سوفی صد سے کم کی طرف اس نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا اور .LRR کی جانب یا تو بڑھ رہا تھا یا LRR کی منزل کو پہونچ چکا تھا۔ بیسویں صدی کے اس عظیم مجدد کا یا تو اتنا وسیع مطالعہ تھا کہ وہ فی زمانہ کرنسی نوٹ کی Inconvertibility اور RR کے سو فیصد سے کم ہونے سے واقف تھے یا اس عظیم مجدد کی تیسری آنکھ مستقبل کی دیوار پر لکھی ہوئی مذکورہ خصوصیات کو ایک کھلی تحریر کی طرح پڑھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے کرنسی نوٹ کو قیمتی مال قرار دیا تھا نہ کہ رسید یا کسی دستاویز کی سند۔ کرنسی نوٹ اپنے مرحلے میں تو Deposite کیے گئے مال کی رسید رکھی تھی لیکن بعد کے مراحل میں جب Deposite کے بغیر بھی کرنسی نوٹ جاری کی جانے لگی، تو یہ رسید نہیں رہی، بلکہ اب یہ ایک قیمتی مال بن چکی ہے اور آج بھی اسی پوزیشن پر برقرار ہے۔ اعلیٰ حضرت کی اس دوراندیشی اور دوربینی نے علمائے کرام کی عام صفوں سے اونچا اٹھا کر آپ کو مجددِ عصر کے بلند تخت پر براجمان کر دیا ہے۔

کرنسی نوٹ آج رسید نہیں ہے، بلکہ یقیناً ایک قیمتی مال ہے۔ اسی طرح سے کرنسی نوٹ چیک بھی نہیں ہے، جیسا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے فرمایا ہے۔ چیک کاغذ کا ایک ایسا پرزہ ہے، جو اپنی تمام تر شرائط کے ساتھ متعلقہ بینک میں Honour ہوتا ہے، یعنی اس پر تحریر

کردہ رقم چیک ہولڈر کو ملتی ہے یا اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے۔ آپ کسی بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولیے، آپ کی بینک آپ کو ایک چیک بک دے گی۔ حسب ضرورت اس کے ایک Leaf کی مکمل خانہ پری کر کے جب آپ اسے مذکورہ بینک میں (یا کسی دوسری بینک میں کسی کے ذریعے سے) پیش کریں گے اور اگر آپ کے اکاؤنٹ میں کم از کم اتنی رقم محفوظ ہو، جتنی کہ آپ نے اپنے چیک پر درج کی ہے، تو بینک آپ کو اتنی رقم (بہ شکل کرنسی نوٹ یا/اور خوردہ) آپ کے سپرد کر دے گی۔

کرنسی نوٹ اور چیک کے درمیان کچھ بنیادی فرق ہیں، مثلاً (۱) کرنسی نوٹ کو آج سو فیصد Backing نہیں ہے، جب کہ آپ کے چیک کو سو فیصد Backing لازمی ہے۔ (۲) آپ کا جاری کردہ چیک مندرج تاریخ سے چھ ماہ کے اندر ہی Honour ہو سکتا ہے، جب کہ کرنسی نوٹ ایسی کسی بھی قید سے آزاد ہے۔ (۳) آج کرنسی نوٹ Legal Tender کی حیثیت رکھتی ہے، اسے قبول نہ کرنے والا شخص قانونی چارہ جوئی کیے جانے کا مجاز ہو سکتا ہے، جب کہ چیک نہ قبول کرنے والے کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ (۴) کرنسی نوٹ کو آج قبول عام (General Acceptability) کی پوزیشن حاصل ہے، جب کہ آپ کا چیک Limited Accecptability رکھتا ہے۔ آپ کا حقیقی بھائی بھی چاہے، تو اسے قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ غالب گمان ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب ان فرقوں سے ناواقف تھے۔

مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے کرنسی نوٹ کو چیک گردانا ہے۔ کرنسی نوٹ اپنے ارتقا کے پہلے مرحلے میں شاید مولوی صاحب کی نظر میں چیک رہی ہو، آپ کا غالباً یہ گمان رہا ہو کہ Depositor جب سونا کسی مرچنٹ کے پاس محفوظ رکھواتا تھا، تو مرچنٹ اسے ایک رسید دیتا تھا اور جسے وہ کبھی بھی واپس دے کر اپنا سونا واپس لے جا سکتا تھا، چیک کی طرح یہ کرنسی نوٹ بھی اپنی مطلوبہ رقم طلب (Demand) کرنے کا ذریعہ تھی، لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس زمانے کی بھی کرنسی نوٹ ان خواص سے عاری تھی، جن خواص کا چیک حامل ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا فرق بالکل واضح ہے۔ پہلے مرحلے کے کرنسی نوٹ پر اسے جاری کرنے والے مرچنٹ کی دستخط ہوتی تھی، یہ دستخط شدہ کرنسی نوٹ Depositor کو مرچنٹ سے ملتی تھی، جب کہ چیک

Depositor اپنی دستخط سے بینک کو دیتا ہے۔ اتنا واضح فرق گنگوہی صاحب نہیں سمجھ سکے جب کہ مجد دِ عصر اعلیٰ حضرت نے ان تمام فرقوں کو بخوبی محسوس کر لیا تھا، چنانچہ آپ نے کرنسی نوٹ کو چیک کے طور پر نہیں گردانا۔ اس سبب سے بھی مولوی رشید احمد گنگوہی کی کم نگاہی کے مقابلے میں اعلیٰ حضرت کی باریک بینی نے اعلیٰ حضرت کو معاصر علمائے کرام کی عام صفوں سے اونچا اٹھا کر آپ کو مجد دِ عصر کے بلند و بالا تخت پر براجمان کر دیا ہے۔

اب جس عنوان کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ عنوان اپنے آپ میں زبردست نوعیت کا حامل ہے اور علم معاشیات میں آپ کے مجد دِ عصر ہونے کی نہایت روشن دلیل ہے۔

۱۹۱۲ء میں اعلیٰ حضرت نے ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا تحریر پیش فرمائی تھی۔ اس کتاب کے ذریعہ آپ نے اس زمانے میں مسلمانوں کے معاشی مسائل کو محسوس کیا تھا اور ایک نہایت جامع حل پیش فرمایا تھا۔ یہ حل چار نکات پر مشتمل تھا، جنھیں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے چار نکات:

اول: باستثنا ان معدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے تمام معاملات (مسلمان) اپنے ہاتھ میں لیتے، اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصل کرتے یہ کروڑوں روپئے جو اسٹامپ اور وکالت میں گھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ ہو گئے اور ہوئے جاتے ہیں، محفوظ رہتے۔

اس نکتے کے تحت اعلیٰ حضرت عامۃ المسلمین کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان تمام تر لڑائی جھگڑوں کو فیصل کرنے کے لیے انگریز حکومت کی عدالتوں میں جانے کے بجائے اپنی پنچایتوں میں طے کرتے، تو اس سے ان کے کروڑوں روپئے پس انداز (Saving) ہوتے، جو اسٹامپ پیپروں اور وکیلوں میں صرف ہو رہے تھے اور ان مقدمات سے جو معاشرتی تباہی رونما ہو رہی تھی اس سے بھی بچ جاتے۔ مقدمات کو کورٹوں کے بجائے اگر شرعی نقطۂ نظر سے حل کر لیا جاتا، تو اس سے کروڑوں روپئے پس انداز (Saving) ہو جاتے۔ اس Saving سے مسلم معاشرے کو کتنا زبردست معاشی فائدہ پہنچتا اس پر ہم آگے گفتگو کریں گے۔

دوم: اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حرفت و تجارت

کوترقی (Investment) دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہیں رہتے یہ نہ ہوتا کہ یورپ وامریکہ والے چھٹانک بھر تانبہ کچھ صناعی کی گھڑت کر کے گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اوراس کے بدلے پاؤ بھر چاندی آپ سے لے جائیں۔

اس نکتے میں اعلیٰ حضرت نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ مسلم خریدار، مسلمان تاجر یا صناع سے ہی سامان خریدے تاکہ گھر کا نفع گھر میں ہی رہے۔ اس سے مسلمانوں کی حرفت و تجارت کوفروغ ملتا۔ ایک طرف کاروبار میں لگایا گیا روپیہ (Investment) بڑھتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بے کاری میں کمی ہوکر روزگار (Employment) میں اضافہ ہوتا۔ جہاں تاجروں اورصناعوں کی مالی حالت بہتر ہوتی، وہیں محنت کشوں (Labourers) کی بھی معاشی حالت سدھرتی اوراس طرح سے مسلم معاشرے میں ایک معاشی انقلاب آجاتا۔

سوم: بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بینک کھولتے۔ سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے۔ مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے اوراس کا ایک نہایت آسان طریقہ "کفل الفقیہ الفاھم" میں چھپ چکا ہے۔ ان جائز طریقوں پر نفع بھی لیتے کہ انھیں بھی فائدہ پہونچتا اوران کے بھائیوں کی بھی حاجت برآتی اور آئے دن جو مسلمانوں کی جائیدادیں بنیوں کی نذر ہوئی چلی جاتی ہیں، ان سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر مدیون کی جائیداد ہی لی جاتی، مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بنئے چنگے۔

اس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک نہایت ہی انقلابی مشورہ مجددِ عصر اعلیٰ حضرت نے دیا تھا۔ اس زمانے میں بھی بینکنگ سسٹم کی بنیاد سود پر تھی۔ سود کے بغیر بینک کے وجود کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ ایسے دور میں اعلیٰ حضرت نے غیر سودی بینک کا نظریہ پیش کر کے دینی جدت طرازی کی ایک زبردست مثال قائم کر دی تھی۔ آپ نے چند مخصوص شہروں کے مالدار مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ غیر سودی بینک قائم کر کے اپنے ان مسلمان بھائیوں کی مالی اعانت کریں، جو کسی حرفت یا صنعت میں قسمت کو آزمانا چاہتے ہیں اوران کے پاس سرمایہ کی کمی ہے۔ نیز، شریعت نے سود کو قطعی حرام قرار دیا ہے مگر اور بھی بہت سارے طریقے ہیں، جن کے ذریعے نفع کمایا جا سکتا ہے اور وہ بھی حلال نفع اور یہ سارے طریقے فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔ خود اعلیٰ حضرت نے بھی اپنی ایک تحریر میں ایک نہایت

آسان طریقہ بیان فرما دیا ہے، اگر ایسا ہوتا ہے، تو قرض خواہوں کا اس میں دوہرا فائدہ ہے، ایک تو وہ سود جیسے حرام مال سے بچتے ہیں، دوسرے انھیں بنیوں سے نجات مل جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ قرض دینے والے مالدار مسلمانوں کو بھی اپنی فاضل رقم (Saving) کو کاروبار میں لگانے (Investment) سے نفع ملے گا اور وہ بھی حلال۔

مسلمانوں کے لیے غیر سودی بینک ہی ایک ایسا ادارہ ہوسکتا ہے، جہاں شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے پس انداز (Saving) کرنے والے مالدار مسلمانوں اور کاروبار میں روپیہ لگانے (Investment) کی صلاحیت رکھنے والے حوصلہ مند مسلمانوں کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ اس بینک میں وہ کروڑوں روپئے بھی لائے جا سکتے ہیں جو کورٹ کچہری کی نذر ہو رہے ہیں۔

Saving اور Investment کے اس عنوان پر مزید اور تفصیلی گفتگو آگے کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

چہارم: سب سے زیادہ اہم، سب کی جان سب کی اصل اعظم وہ دین متین تھا، جس کی رسی مضبوط تھامنے نے اگلوں کو ان مدارج عالیہ پر پہونچایا، چار دانگ عالم میں ان کی ہیبت کا سکہ بٹھایا، نان شبینہ کے محتاجوں کو مالک بنایا اور اسی کے چھوڑنے، نے پچھلوں کو یوں چاہ ذلت میں گرایا **فانا للّٰہ وانا الیہ راجعون ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم**۔ دین متین علم دین کے دامن سے وابستہ ہے۔ علم دین سیکھنا پھر اس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہاں کی زندگی جانتے، وہ انھیں بتا دیتا۔ اندھو! جسے ترقی سمجھ رہے ہو، سخت تنزل ہے۔ جسے عزت جانتے ہو، اشد ذلت ہے۔

یہی نکتہ تو ہماری اساس ہے۔ دین کا علم اور اس پر عمل ہی ایک مسلمان کو وہ مسلمان بنا دیتا تھا کہ جنھیں دیکھ کر لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔ یہ دین ہی تو ہے جو ایک مسلمان میں ایمانداری، للّٰہیت اور خلوص پیدا کرتا ہے۔ یہ دین ہی تو ہے جو ایک مسلمان کو مفاد پرستی، خود غرضی اور دھوکہ دہی سے محفوظ رکھ کر یہودیوں اور اس قبیل کی ذہنیت رکھنے والے تمام لوگوں سے ممتاز کرتا ہے، اہمیت و افادیت کے اعتبار سے یہ آخری نکتہ حرف آخر سے کم نہیں ہے۔

ان چاروں نکات کے پیش نظر اعلیٰ حضرت تمام مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ "اگر میرا خیال صحیح ہے، تو ہر شہر اور قصبہ میں جلسے کریں اور مسلمانوں کو ان چاروں باتوں پر قائم

کریں۔‘‘ اعلیٰ حضرت کی اس اپیل کے پیش نظر میری رائے یہ ہے کہ یہ چاروں نکتے بکھری ہوئی چار موتیاں نہیں ہیں، بلکہ ایک لڑی میں اس طرح پروئی ہوئی ہیں کہ وہ ایک خوبصورت اور نہایت کارآمد ہار بن گیا ہے۔ اس ہار کو پیکر اسلامیہ کی گردن میں آج بھی اگر ڈال دیا جائے تو اس کا سارا وجود جگمگا اٹھے گا۔ میرا یہ دعویٰ بھی بے دلیل نہیں ہے۔ آئندہ سطروں میں ان چاروں نکات کو مربوط کر کے پیش کرنے کی سعی کی جائے گی اور پھر آپ دیکھیں گے کہ باہم مربوط ہو کر یہ چاروں نکات عمل کے مرحلے سے گزریں گے، تو کتنے انقلاب آفریں نتائج سے ہم کنار ہوں گے۔

چاروں نکات کے باہمی عمل کے نتائج: ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک کا دس سالہ دور عالمی کساد بازاری (Great Depression) کا دور تھا۔ ۱۹۲۹ء کے آغاز سے قیمتوں کے گرنے کا دور شروع ہوا۔ یکے بعد دیگرے حرفت وصنعت میں منافع کی شرح گرتی چلی گئی۔ کارخانوں پر کارخانے بند ہوتے چلے گئے۔ بے روزگاری عام ہو گئی۔ ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں جے ایم کینز (John Meynord Keynes) نے ’’نظریہ روزگار و آمدنی‘‘ پیش کیا، جس پر عمل کرنے کی شروعات سے غالباً ۱۹۳۵ء سے عالمی کساد بازار تحلیل ہونا شروع ہوئی اور اس کا مکمل خاتمہ ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں اس برطانوی ماہر معاشیات جے ایم کینز کو اس خدمت کے صلے میں حکومت برطانیہ کا ایک نہایت محترم ایوارڈ ’’لارڈ‘‘ تفویض کیا گیا۔

جے ایم کینز کے نظریۂ روزگار آمدنی کے مطابق ہر صارف (Consumer) کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ صرف (Consumption) کے لیے مختص ہوتا ہے۔ اگر آمدنی اس صرف سے زائد ہے، تو وہ صارف کچھ نہ کچھ رقم پس انداز (Saving) کر لیتا ہے۔ پس انداز کی گئی یہ رقم (Saving) معیشت میں بڑا اہم رول ادا کر سکتی ہے، چنانچہ

آمدنی = صرف + پس اندازی (Y=C+S)

اسی طرح سے کینز کے مطابق ہر صناع (Industrialists, Investors, etc) صارف کی طرح اپنی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ صَرف (Consumption) پر خرچ کرتا ہے، اگر اس کی آمدنی صَرف سے زائد ہے، تو بقیہ رقم کاروبار میں لگاتا (Investment) ہے۔ کاروبار میں لگائی گئی یہ رقم (Investment) معیشت میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہے چنانچہ

آمدنی = صرف + کاروبار میں لگائی گئی رقم (Y=C+I)

کینز کے مطابق یہ دو مساوات (Y=C+S & Y=C+I) نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان دونوں مساوات میں Y اور C مشترک (Common) ہیں، اگر انھیں کٹ کر دیا جائے تو S&I بچتے ہیں۔ اگر Saving، Investment سے زیادہ ہو جائے، تو کساد بازاری کی شروعات ہو جاتی ہے، اس کے برعکس اگر Saving، Investment سے کم ہو جائے تو معیشت افراطِ زر کا شکار ہو جاتی ہے، چنانچہ علم معاشیات کے اس نباض (جے ایم کینز) نے اس بات پر زور دیا کہ Saving اور Investment کا ایک دوسرے کے برابر ہونا نہایت ضروری ہے۔ نیز اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ تیز رفتار معاشی ترقی کے لیے Saving میں اضافہ اس طرح جاری رہے کہ Investment بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے، تو ملک کی معاشی ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی جائے گی۔

جے ایم کینز نے اپنے نظریہ روزگار و آمدنی میں ایک نئی معاشی اصطلاح کا بھی استعمال کیا ہے، جسے وہ موثر طلب (Effective Demand) کہتے ہیں۔ اوپر کے سطور میں ہم نے کینز کے دو مساوات دیکھے ہیں۔ اول Y=C+S اور دوم Y=C+I ان دونوں فارمولوں سے اگر Y کو مشترک ہونے کے سبب حذف کر دیا جائے، تو باقی رہ جاتے ہیں C+S اور C+I، C+S کو اس نے ''کل رسد'' یعنی Aggregate Supply اور C+I کو ''کل طلب'' یعنی Aggregate Demand کہا ہے۔ جہاں Aggregate Supply اور Aggregate Demand ایک دوسرے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ وہ مقام ''موثر طلب'' (Effective Demand) کی نشاندہی کرتا ہے، ملک میں کتنے لوگوں کو روزگار ملے گا، آمدنی کتنی ہوگی اس کا تعین ''موثر طلب'' ہی کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک موثر طلب پر مکمل روزگاری (Full Employment) اور اعلیٰ ترین آمدنی (Maximum Income Level) کی نشاندہی کرے۔ اس مقام پر کچھ بے روزگاری (Unemployment) بھی ممکن ہے، چنانچہ آمدنی کی سطح، اعلیٰ ترین آمدنی سے کم بھی ہو سکتی ہے۔

جے ایم کینز نے اپنے نظریہ روزگار و آمدنی میں دو اور معاشی اصطلاحوں کو بہتر ڈھنگ سے متعارف کیا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں ہیں Multiplier اور Accelerator۔ Multiplier کا تعلق کینز کے پہلے فارمولے (Y=C+S) کے C اور S سے ہے۔

Consumption یعنی صَرف جتنا زیادہ ہوگا Multiplier کے سبب آمدنی (Y) اور روزگار (Employment) میں اس سے زیادہ تیزی سے اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس Saving جتنی زیادہ ہوگی اس کے تیز تر منفی اثرات آمدنی اور روزگار پر پڑیں گے۔

اسی طرح Accelerator کا تعلق کینز کے دوسرے فارمولہ (Y=C+I) سے ہے۔ Investment یعنی روپیہ کاروبار میں جتنا زیادہ لگایا جائے گا Accelerator کے سبب اس سے کہیں زیادہ تیزی سے آمدنی اور روزگار میں اضافہ ہوگا۔

جے ایم کینز کے نظریہ روزگار اور آمدنی کا یہ نہایت مختصر اور ممکنہ حد تک سلیس خاکہ ہے۔ کینز کے اس نظریہ نے عالمی کساد بازاری کا خاتمہ کر دیا تھا، جس پر حکومت برطانیہ نے انھیں ''لارڈ'' کے عظیم الشان خطاب سے ۱۹۳۶ء میں سرفراز کیا تھا۔

لیکن مجددِ عصر اعلیٰ حضرت نے تو یہ کارنامہ ۱۹۱۲ء میں ہی انجام دے دیا تھا۔ اپنی تحریر ''تدبیر فلاح ونجات و اصلاح'' میں آپ نے اپنے الفاظ میں مسلمانوں کی معاشی حالت کی اصلاح کے لیے پس اندازی (Saving) اور روپیہ کاروبار میں لگانے (Investment) کا وہ نظریہ پیش کیا تھا، جو روزگار اور آمدنی کے اضافے کا سبب بن سکتا تھا۔

بعض تنقید نگار ایسا کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کے مقابلے میں کینز کا نظریہ زیادہ سائنٹفک ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اعلیٰ حضرت کا ماڈل بہر حال افادیت سے خالی نہیں ہے اور اس میں وسعت وفکری ہمہ گیریت کا عنصر غالب ہے۔

جیسا کہ پچھلی سطور میں ہم نے پڑھا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی تحریر ''تدبیر فلاح ونجات و اصلاح'' چار نکات پر مشتمل ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے ان چاروں نکات کو اختصار کے ساتھ ذیل میں پھر تحریر کیا جا رہا ہے۔

(۱) مسلمان مقدمہ بازیوں سے بچیں، تاکہ ان پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپئے پس انداز (Saving) ہوں۔

(۲) اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں، تاکہ اپنی قوم کے صناعوں وغیرہ کے کاروبار پر کیا جانے والا خرچ (Investment) بڑھے۔

(۳) مالدار مسلمان بینک قائم کریں، تاکہ ان کی فاضل رقم / پس انداز کی ہوئی رقم (Saving)

مسلم صناعوں کے ذریعے کاروبار میں صَرف (Investment) ہو۔ مقدمہ بازی سے بچی ہوئی کروڑوں کی رقم بھی اس بینک کی طرف منتقل کی جا سکتی ہے، جس سے Saving اور Investment دونوں میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

(۴) علم دین کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ جس سے لوگوں میں بالخصوص امرا، صناعوں، محنت کشوں اور صارفین کے ساتھ ساتھ عامۃ المسلمین کی بالخصوص معاشی معاملات میں اخلاقی اصلاح ہو۔

کینز کا نظریہ لاکھ سائنٹفک سہی، لیکن اس کا نظریہ روزگار و آمدنی اس نہایت اہم خصوصیت سے بالکل محروم ہے۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت عام فہم زبان میں بھاری بھرکم معاشی اصطلاحوں کے بغیر تقریباً وہی تمام باتیں کہی ہیں، جو کینز کے نظریہ میں ملتی ہیں۔ کینز نے اپنے نظریہ میں Saving اور Investment کی اہمیت کو اجاگر تو کیا ہے، لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر رہا کہ Saving کہاں سے حاصل کی جائے گی اور Investments کے اضافے کی کیا صورت ہوگی۔ مقدمہ بازی پر کیا گیا خرچ مکمل طور پر غیر پیداواری (Unproductive) ہے، اسے Saving میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ نیز امرا کے پاس فاضل رقم پڑی ہوئی ہے، جو سامان تعیش و رنگ رلیوں پر خرچ ہوکر ضائع ہو جاتی ہے، یہ بھی بڑی حد تک غیر پیداواری (Unproductive) ہے۔ اسے بھی Saving میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں ذریعوں سے ایک اچھی خاصی رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔

مالدار مسلمان اگر بینک کا قیام عمل میں لائیں، تو مذکورہ بالا Savings کو بینک میں جمع کر کے ایک اچھا خاصہ سرمایہ فراہم کیا جاسکتا ہے اور اس غیر سودی اسلامی بینک کے ذریعے یہ سرمایہ ان مسلم صناعوں، تاجروں وغیرہ کو مہیا کر کے Investment کو بڑھایا جاسکتا ہے، جن کے ذریعے ایک طرف صناع، تاجر وغیرہ منافع کما سکتے ہیں، دوسری طرف کتنے ہی محنت کشوں کو روزگار فراہم ہوسکتا ہے، چنانچہ اعلیٰ حضرت کے اس ماڈل سے بھی وہی نتائج اخذ ہو سکتے ہیں جو کینز کے نظریہ روزگار و آمدنی سے متوقع ہیں۔

اگر قومِ مسلم اپنی اشیائے ضروریات صرف مسلم تاجروں سے ہی خریدے، تو مسلم

صناعوں کے کارخانوں میں تیار کیے گئے مال کی نکاسی بازار میں ہوتی رہے گی اور زائد از ضرورت پیداوار (Over Production) کا مسئلہ بھی درپیش نہیں آئے گا۔

اسی نظریہ کو اگر قوم مسلم سے وسیع کر کے ملک کی حدود تک پھیلا دیا جائے، تو ملک سے Over Production کے اس عفریت کا خاتمہ ہو جائے گا جو کساد بازاری کا سبب بنتا ہے۔ یورپی اقوام اعلیٰ حضرت کے اس نظریہ کو غیر شعوری طور پر قبول کر کے Europiean Common Market کا قیام عمل میں لائیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ جرمن مارک ایک مضبوط کرنسی کے طور پر نمودار ہوا، یہاں تک کہ اس کرنسی نے امریکی ڈالر کو بھی کمزور کر دیا۔

اعلیٰ حضرت کا اپنا یہ نظریہ کہ اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں، بعض متقدم اور متاخر یورپی مفکرین کے خیال سے ہم آہنگ ہے، مثلاً جرمن کے ماہر معاشیات فریڈرک لسٹ (Friedrich List) نے ۱۸۴۰ء میں یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ الفریڈ مارشل اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کا زبردست وکیل تھا، اس نے بھی بعض صورتوں میں آزادانہ تجارت (Free Trade) کے مقابلے میں محفوظ تجارت (Protection) کی وکالت کی تھی۔ اس طرح سے اٰدم اسمتھ (Adam Smith) جو بابائے علم معاشیات (Father of Economics) کہلاتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت (Capitalism) کا سب سے زیادہ پر جوش حامی تھا اور جس کی کتاب دولتِ اقوام Wealth of Nations کو علم معاشیات میں انجیل کی طرح معتبر و محترم سمجھا جاتا ہے، اس شخص نے بھی کچھ خصوصی صورت حال میں نظریہ تامین (Protection Policy) کی سفارش کی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کے حامل ملک امریکہ کے ایک سیاست داں الیگزینڈر ہملٹن نے بھی امریکیوں کو وہی راہ دکھانے کی کوشش کی، جس پر چلنے کا مشورہ اعلیٰ حضرت نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ صنعتی طور پر ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ امریکہ اور یورپ کے بیشتر ممالک نے برطانیہ کے خلاف تامین (Protection) کی حکمت عملی اپنائی تھی۔

خود لارڈ کینز نے کہا ہے کہ "Protection and not free trade was needed to restore the much needed economic stability for an economy which is out of gear" لیکن ہم مسلمانوں/ ہندوستانیوں

نے اس مفکرِ مشرق کی باتوں کو اَن سنی کر دیا، جب کہ یورپ اور امریکہ نے اپنے مغربی مفکرین کو نہ صرف سر آنکھوں بٹھایا، بلکہ حد درجہ تن دہی کے ساتھ اس کے نفاذ میں جٹ گئے، نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی میدان میں وہ ہم سے کہیں آگے ہیں۔ کیا ایسا ہے کہ کوٹ ٹائی والے ایک شخص کے مقابلے میں صافہ اور کرتا پہننے والے دوسرے شخص کی کیا وقعت؟

ماہرین معاشیات عام حالات میں آزادانہ تجارت (Free Trade) کے حامی ہیں، لیکن خصوصی حالات میں محفوظ تجارت (Protection) کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مسلمانان ہند بالخصوص اور مسلمانان عالم بالعموم کن حالات کا شکار تھے۔ اسی طرح کیا آج مسلمان عام حالات میں سانسیں لے رہے ہیں یا ہنگامی حالات سے دوچار ہیں؟

اعلیٰ حضرت کے چار نکاتی ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' نامی پروگرام میں تیسرا نکتہ بینک کے قیام سے متعلق ہے۔ آپ نے اس زمانے میں بینک کے قیام پر زور دیا، جب مسلمانوں میں کیا برادرانِ وطن میں بھی Banking Habit کا بہت کم رجحان تھا۔ برادرانِ وطن کہیں کہیں بینک قائم کر چکے تھے۔ ۱۷۷۰ء میں پہلا ہندوستانی بینک ''بینک آف ہندوستان'' کے نام سے قائم ہوا تھا۔ ۱۹۱۳ء تک ہندوستان میں صرف اکتالیس بینک قائم ہو سکے تھے اور ۱۹۴۰ء تک کوئی بھی مسلم بینک وجود میں نہیں آیا تھا۔ آپ نے اس زمانے میں غیر سودی اسلامک بینک کے قیام کی تجویز پیش کی تھی، جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ سود کے بغیر بینکنگ کاروبار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم برصغیر میں غیر سودی اسلامی بینک کے قیام کا تصور اگر کسی نے دیا ہے، تو وہ ہیں مجدد عصر اعلیٰ حضرت۔

ماہر معاشیات پروفیسر رفیع الدین صدیقی نے اپنے مقالہ ''فاضل بریلوی کے معاشی نکات'' میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ جب جدید اقتصادی نظریات کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی اور بنک کاری نظام کو مغربی ماہرین تجارت واقتصادیات نے اس شدت سے محسوس تک نہ کیا تھا، جو آج وہ عمل میں لا رہے ہیں، حضرت فاضل بریلوی نے اس سے تقریباً پچیس سال قبل معاشی نکات اور بنک کاری نظام کا نظریہ پیش فرما دیا تھا۔

مجددِ عصر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ ''سود شرع نے حرامِ قطعی فرمایا ہے، مگر اور سو طریقے

نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے۔'' آپ نے ''کرنسی نوٹ کے مسائل'' (کفل الفقیہ) نامی کتاب میں اس کی تفصیل پیش کی ہے گویا کہ اعلیٰ حضرت نے نہ صرف غیر سودی بینک کے قیام کی تجویز پیش کی ہے، بلکہ سود سے بچتے ہوئے نفع حاصل کرنے کے ان طریقوں کی نشاندہی بھی کردی ہے، جن کی شریعت مطہرہ اجازت دیتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ حضرت کی ان تحریرات کو یکجا کیا جائے اوران سے استفادہ کر کے عصری تقاضوں کے مطابق ایک ایسا منضبط نظام ترتیب دیا جائے، جو قابل عمل بھی ہو، بہر حال غیر سودی اسلامی بینک کے نظام کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی جسارت کررہاہوں۔

غیر سودی اسلامی بینک درج ذیل خدمات معاشرے میں پیش کرسکتی ہے۔

اول: ڈپازٹ کا حصول: سودی کمرشیل بینکس سود کی پیشکش کر کے لوگوں کی فاضل رقومات بطور ڈپازٹ قبول کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہیں۔غیر سودی اسلامی بینک سود کے بجائے نفع اور نقصان میں حصہ داری کی بنیاد پر لوگوں سے اپنی فاضل رقم بطور ڈپازٹ رکھنے کی گزارش کر سکتی ہے، اس ذریعہ سے حاصل شدہ رقم ضرورت مندوں میں معاشی پیداواری مقصد (Economic Productive Purpose) کیلیے رقم فراہم کرسکتی ہے۔

دوم: پیداواری مقصد کے لیے/ کاروبار وتجارت کے لیے ضرورت مندوں کو رقم فراہم کرنا:

سماج کے ایسے افراد جو کسی صنعت وحرفت کے جاری کرنے یا تجارت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، لیکن رقم کی عدم فراہمی یا کم فراہمی کے سبب اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں کر پارہے ہیں، یہ بینک ایسے افراد کو مختلف شکلوں میں رقم فراہم کرسکتی ہے۔رقم کی یہ فراہمی نفع اور نقصان میں حصہ داری کی ہی شکل میں ہوگی۔

اس کار خیر میں رقم کے استعمال کی درج ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

(۱) شراکت (۲) مضاربت (۳) اجارہ (کرایہ دینا)(۴) سلم (ایڈوانس)

(۵) اگر ممکن ہوا، تو بینک تنہا تجارت بھی کرسکتی ہے، مثلاً ایک صنعت کار ایک مشین خریدنے کا خواہش مند ہے۔ مشین کی قیمت دس لاکھ روپئے ہے۔اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ مشین خرید سکے۔غیر سودی اسلامی بینک وہ مشین دس لاکھ میں خرید کر اس صنعت کار کو گیارہ لاکھ میں کچھ مدت میں ادائیگی کی شرط پر مہیا کرسکتی ہے، اگر وہ صنعت کار اس بینک سے رجوع ہوتا ہے تو۔اس

طرح سے اس بینک نے اس تجارت میں ایک لاکھ منافع کما لیا۔

سوم: ان دونوں خدمات کے علاوہ بینک بہت سے کام بطور ایجنٹ (Agency Functions) اور خدمات برائے فلاح عامہ (General Utility Services) انجام دے سکتی ہے یہ دونوں طریقے بھی منافع کمانے کا اچھا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مثلاً

(الف) خدمات بطور ایجنٹ: (۱) مختلف مالیاتی دستاویزات کا حصول اور ادائیگی مثلاً چیک، بل وغیرہ (۲) رقم کی منتقلی (۳) قسطوں، قرضوں اور پریمیوں کی ادائیگی (۴) وصیتوں کے نفاذ کی ذمہ داری (۵) کسی شخص کے لیے شیئر وغیرہ کی خرید و فروخت (۶) Dividend کی حصولیابی۔

(ب) خدمات برائے فلاح عامہ: (۱) Letter of Credit جاری کرنا (۲) زرمبادلہ میں Dealing کرنا (۳) Safe Deposit کی سہولت مہیا کرنا (۴) صنعت و تجارت وغیرہ سے متعلق معلومات (درخواست پر) بہم پہونچانا (۵) کسی دوسری غیر سودی اسلامی بینک کی جانب سے کسی صنعت کار وغیرہ کو مہیا کی گئی رقم کی واپسی کی تحریری یقین دہانی دینا (Underwriting)

سودی بینکس جہاں پیدواری مقاصد Productive Purpose کے لیے قرض دیتی ہے، وہیں غیر پیداواری مقاصد (Unproductive Purpose) کے لیے بھی قرض دیتی ہے۔ بعض حضرات گھر کی تعمیر یا خریدنے کے لیے یا سامان تعیش مثلاً کار، ٹی وی وغیرہ جیسے غیر پیداواری مقاصد خرید کے لیے قرض لیتے ہیں۔ دیہاتوں میں تو آج بھی ساہوکاروں سے بھاری سود پر بعض لوگ شادی بیاہ جیسے اخراجات کے لیے قرض لیتے ہیں۔ ایسے قرضوں میں بینک کو بھاری سود ملتا ہے لوگ نام و نمود کے لیے یا (سامان تعیش کی) حرص و ہوس جیسی اپنی کمزوریوں کے لیے بھاری سود پر سودی بینک سے قرض لیتے ہیں، بینک ایسے قرض خواہوں کا بھرپور استحصال کر کے اپنا نفع بڑھاتی ہے۔ غیر سودی اسلامی بینکوں میں قرض خواہوں کے ایسے استحصال کی تقریباً نہیں کے برابر گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوم یہ کہ سودی بینک کا سرمایہ چوں کہ غیر پیداواری قرضوں پر صرف ہو گیا ہے، اس لیے پیداواری قرض کم ہو جاتے ہیں، جس سے قومی پیداوار متاثر ہوتی ہے۔

''تدبیر فلاح و نجات و اصلاح'' میں اعلیٰ حضرت نے جو چوتھا نکتہ پیش کیا ہے، وہ ہے علم

دین کا حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ آپ نے اسے ضروری قرار دیا ہے، یہ نکتہ اول کے تین نکات کی اساس ہے۔ علم دین کا حصول اور اس پر عمل ہی اللہ کی وہ رسّی ہے، جو بقیہ تین نکات کو باندھ کر رکھ سکتی ہے اور انھیں اس قابل بنا سکتی ہے، جس سے معیشت کو بھرپور فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ نکتہ ایک مسلمان میں اچھے برے کی اور حلال حرام کی تمیز پیدا کرے گا۔ شریعت کے معاشی ابواب کے مطالعہ سے شراکت اور مضاربت جیسے طریقوں کی فہم اس میں پیدا ہوگی، جس سے اس کے لیے Investment کے ایسے کئی راستے کھل سکتے ہیں، جن سے اس کی حلال آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے، جب کہ بچت کرنے والوں کے لیے سودی بینک صرف ایک ہی راستہ کھولتا ہے، وہ ہے سود کا راستہ جسے شریعت حرام قرار دیتی ہے۔

اس چوتھے نکتہ کا تعلق حصول علم سے ہے۔ علم دو طرح کے ہو سکتے ہیں اول دینی علم دوم دنیوی علم۔ اعلیٰ حضرت نے دینی علم کے حصول کو ترجیح دی ہے، جب کہ آپ کے ایک ہم عصر سرسید احمد خاں نے دنیوی علم کے حصول پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیوی علم کی بھی اپنی افادیت ہے ایک روایت کا مفہوم ہے کہ علم حاصل کرو اس کے لیے چاہے آپ کو چین جانا پڑے۔ بعض مفکرین کی رائے میں یہ روایت دنیوی علم کے حصول کی ترغیب دیتی ہے، کیوں کہ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی چین میں علم دین کا ایسا کوئی مرکز قائم نہیں ہو سکا، جو اسلامی ممالک کے مدرسوں کو آنکھیں دکھا سکے۔ ہاں! دنیوی علم میں اس کے مدارس کا آج وہ مقام ہے کہ دنیا بھر کے طلبہ حصول علم کے لیے چین کا سفر کر رہے ہیں، چنانچہ دنیوی علم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کے حالات ایسے نہیں تھے، جس میں علم دین پر دنیوی علم کو ترجیح دی جاتی۔ عام مسلمانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انگریزی نظام نے انھیں قلاش بنا دیا تھا۔ بھوک اور بیماری جیسی آفتیں ان کے سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ ان آفتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا اور اپنے وجود کو بنائے رکھنا بہت آسان نہیں تھا۔ ان حالات میں سرسید احمد خاں اپنا ایک نکاتی پروگرام لے کر اٹھتے ہیں اور وہ تھا دنیوی علم کا حصول جب کہ اعلیٰ حضرت کا بھی ایک ہی نکاتی پروگرام تھا دین کے ساتھ معاشی فلاح۔ قوم نے سرسید احمد خاں کے مشن پر لبیک کہا، اعلیٰ حضرت کے مشن کو وہ توجہ حاصل نہیں ہو سکی، جس کا یہ متقاضی تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت آج کیا ہے، وہ سچر کمیٹی کی رپورٹ سے پوچھیے۔ آج بھی

مسلمانوں کی شرح خواندگی اطمینان بخش نہیں ہے، جس کی تصویر اس مقالے کے ابتدائی صفحات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دنیوی علم کی اہمیت سے انکار کیے بغیر ایک سوال میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا ہے کہ اس زمانے میں سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن اور اعلیٰ حضرت کی معاشی فلاح کی تدبیر کے درمیان ایک کو ترجیح دینے میں کہیں قوم نے غلطی تو نہیں کی تھی۔؟

قوم کی معاشی پسماندگی کا تقاضہ یہ تھا کہ پہلے دین کی محفوظ زمین پر معیشت کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جاتا، پھر اس قلعہ میں عصری علوم کے بلند و بالا مینار کھڑے کیے جاتے، تو شاید آج مسلمانوں کی حالت اتنی بری نہ ہوتی۔ مشاہدہ یہ ہے کہ شرعی ماحول میں رہ کر جن خاندانوں نے معاشی استحکام حاصل کیا ہے، ان کی آئندہ نسلوں سے دنیوی علوم کے وہ مینار بنے ہیں، جنھیں دیکھ کر رشک آتا ہے اور وہ خاندان جنھیں معاشی استحکام حاصل نہیں ہوا تھا، دنیوی علوم کے حصول میں ان کی آئندہ نسلیں بھی ریس کا گھوڑا ثابت نہ ہوسکیں، یہ بھی مشاہدہ ہے کہ آخر الذکر نسلیں اول الذکر نسلوں کے یہاں معمولی کلرک کے طور پر روٹی روزی حاصل کرنے میں جٹی ہوئی ہیں۔ شرعی حدود و قیود میں رہ کر جن درختوں نے معاشی استحکام حاصل کیا ہے، دنیوی علوم میں ان کی شاخیں زیادہ ہی اونچی جاتی ہیں اور زیادہ ہی ثمر آور ثابت ہوتی ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ اس سے مستثنیٰ ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ بھوکے رہ کر بھی دنیوی علم حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ دنیوی علوم کی کسی اونچی منزل تک پہونچنے میں کامیاب بھی ہوئے ہوں۔ ایسے باعزم افراد کسی سرسید کے محتاج نہیں ہوتے۔ کسی سرسید کے بغیر بھی یہ بہت اونچا اڑ سکتے ہیں۔ سرسید کی اتنی تگ و دو کے باوجود آج بھی مسلمان تعلیم کے اس آسمان سے بہت نیچے ہیں، جہاں برادرانِ وطن کہیں زیادہ تعداد میں چمک رہے ہیں۔ آخر یہ فرق کیوں؟ میری نظر میں اس کا بنیادی سبب ہے معاشی استحکام۔ مسلمانوں کے مقابلے میں برادرانِ وطن کی مالی حالت کہیں زیادہ مستحکم ہے، اس لیے دنیوی علوم میں وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔

سرسید کے تعلیمی مشن نے مسلمانوں کا ایک اور زبردست نقصان کیا ہے۔ چونکیے مت۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ پڑھئے۔ جیسا کہ اولین سطروں میں سچر کمیٹی کی رپورٹ کے حوالے سے بتایا گیا ہے، مدرسہ جانے والے طلبا کی تعداد محض تین فیصد ہے۔ یہ بھی ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

سر سید کا عصری تعلیم کا فیصلہ ایک اور نقصان کا سبب بنا ہے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کو راہ دی ہے، جس کے سبب مسلمانوں نے اسلامی کلچر کھویا ہے اور ہندوستان نے ہندوستانی کلچر۔

آج بھی مسلمان معاشی طور پر (باعتبار مجموعی) بہت پسماندہ ہیں، تعلیم کے محاذ پر بھی ان کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے کہیں یہ مجدد عصر کی تعلیمات سے رُوگرداں ہونے کی سزا تو نہیں مل رہی ہے اس قوم کو۔

ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گا کہ دنیوی تعلیم کی اپنی اہمیت ہے، جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، لیکن میری نظر میں علم دین اس سے کم اہم نہیں ہے۔ اس لیے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی تعلیم کے اداروں میں دنیوی تعلیم کا اور اسکولوں کالجوں میں دینی تعلیم کے حصول کا موقعہ طالبان علم کو مہیا کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت کی ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' کو عمل میں لانے کی بھی تدبیر کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو مسلمانوں کی معاشی پسماندگی بھی دور ہو جائے گی اور آئندہ نسلیں دنیوی تعلیم کے اونچے آسمان میں کثیر تعداد میں ستاروں کے مانند درخشاں نظر آئیں گے۔

عصر حاضر کے نومسلم دانشور ڈاکٹر محمد ہارون نے اعلیٰ حضرت کے ان چار نکاتی پروگرام پر اپنا تبصراتی اظہارِ خیال چھ مقالوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ آپ نے اس پروگرام کو قوم مسلم کی بحالی کا واحد حل بتلایا ہے۔ موصوف نے اعلیٰ حضرت کے اس چار نکاتی پروگرام کو مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام معاشی مسائل کا حل قرار دیا ہے۔ آپ مزید اظہارِ خیال فرماتے ہیں کہ منصوبۂ رضا ہر عہد، ہر ملک کے مسلمانوں یہاں تک کہ عالم انسانیت کے لیے ایک کلید اور فلاح ونجات کا واحد راستہ ہے۔ موصوف کے مطابق یہ چار نکاتی پروگرام:

۱ لبرل اور سیکولر اسٹیٹس (ہند اور برطانیہ) میں با آسانی قابل عمل ہے۔

۲ مسلم ممالک میں بہت آسانی سے نافذ ہوسکتا ہے۔ مشترکہ مسلم منڈی کے قیام میں بھی یہ مددگار ثابت ہوسکتا ہے اور مغربی طاقتوں کی دخل اندازی سے بھی مسلم ممالک کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

۳ الجزائر (ایک ناکام اسٹیٹ) کو کامیابی سے ہم کنار کرسکتا ہے۔

۴ کسی بڑی سیاسی تحریک، سیاسی دخل اندازی یا مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے بغیر تھوڑی سی سیاسی سرگرمی سے مسلم وقار بحال ہوسکتا ہے۔

۵ آپ کا مذکورہ پروگرام سرکاری ملازمت کی بجائے خود کی حرفت وتجارت پر زور دیتا ہے۔
۶ یہ پروگرام ایسے علاقے میں جہاں مسلمان کثیر تعداد میں رہتے ہیں، ان علاقوں کو معاشی طور پر مضبوط کرسکتا ہے۔ ان علاقوں میں علماوصلحا ملت کی قیادت کرسکیں گے۔
۷ اس پروگرام میں شامل آپ کا ہر نکتہ مذہب سے ہم آہنگ اور مذہب سے ہی مرتکز ہے۔

ہندو پاک کے ماہر معاشیات پروفیسر رفیع اللہ صدیقی تحریر فرماتے ہیں: ''موجودہ صدی کا ربع اول وہ بلا خیز دور تھا کہ بڑے بڑے علما، لیڈر ثابت قدم نہ رہ سکے، ایسے دور میں اعلیٰ حضرت محدث بریلوی نے ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' کے نام سے اُمّت مسلمہ کی معاشی بہبود کی خاطر چار تجاویز پیش کی تھیں، جو آج بھی اپنے اندر وزن رکھتی ہیں اور امام احمد رضا بریلوی کی ژرف نگاہی کی شاہد ہیں۔''...... موصوف مزید لکھتے ہیں: ''جدید اقتصادی نظریات کی ابتدا ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہوئی اور یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ نگاہِ مردِ مومن نے ان جدید اقتصادی تقاضوں کی جھلک ۱۹۱۲ء میں ہی دکھادی تھی۔''

آپ کے معاشی نظریات کمیونزم کے لادینی معاشی نظام کے بالکل برعکس ہیں۔ جن میں انفرادی آزادی مقید ہوکر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح سے یہ نظام معاشی سرگرمیوں کی آزادی کی ضمانت تو دیتا ہے لیکن آج کے سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اخلاقی ضابطوں سے آزاد شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریات کے محور پر محوگردش ہے۔

خلافت عثمانیہ جب تک قائم تھی، دنیا بھر میں مسلمانوں کا ایک سیاسی وقار ودبدبہ تھا۔ اس کے خاتمے کے بعد مسلم مملکتیں ٹوٹے ہوئے ہار کے موتیوں کی طرح بکھر کر رہ گئیں، نتیجتاً پوری دنیا میں مسلمان اور مسلم مملکتیں بے وقعت ہونا شروع ہوگئیں۔ ایسے حالات میں اعلیٰ حضرت کے چار نکاتی پروگرام کی ضرورت اور زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے اس پروگرام کی مدد سے مسلم آئی لینڈ (علاحدہ اسلامی سماج) کے قیام میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ اعلیٰ حضرت مسلم آئی لینڈ کے قیام پر زور دیتے تھے نہ کہ اسلامی اسٹیٹ کے قیام پر۔

مومنانہ فراست، نگاہِ ولایت، جبلی صلاحیت، فطری مہارت، وسیع تر بصیرت، دردمندیٔ ملت، وسیع تر مطالعہ، بے پناہ یادداشت، دور اندیشی اور باریک بینی وژرف نگاہی کسی ایک فرد میں یہ تمام خوبیاں یکجا ہوجائیں، ایسا کم ہی ہوتا ہے، لیکن ایسا ہو بھی سکتا ہے اور ہوا بھی ہے۔ امامِ

اہلسنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) میں اتنی تمام خوبیاں یکجا ہوگئیں تھیں اور انھیں تمام خوبیوں نے آپ کو نہ صرف علم دین کے مجدد کا منصب عطا کیا ہے بلکہ علم معاشیات کے جن جن نظریات پر آپ نے خامہ فرسائی کی ہے ان میں بھی ''مجددِ علم معاشیات'' کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

کتابیات:

۱ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن: مترجم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی

۲ فتاویٰ رضویہ، جلد ہفتم: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی؛ طبع ممبئی

۳ تدبیر فلاح ونجات واصلاح: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی
تقدیم: پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی (کوئنز یونیورسٹی کینیڈا) ناشر نوری مشن مالیگاؤں

۴ کرنسی نوٹ کے مسائل 'کفل الفقیہ' از امام احمد رضا، ادارہ افکار حق، بائسی، پورنیہ بہار

۵ ماہنامہ کنز الایمان دہلی فروری ۲۰۰۱ء، مقالہ از ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی

۶ نشانِ راہ 'مضمون: اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور معاشیات' از ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی
ترتیب وتحقیق: محمد ضیاء الحق نقش بندی

۷ امام احمد رضا محدث بریلوی کا عظیم اصلاحی منصوبہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون (کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ) ترجمہ: ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی، طبع بریلی

۸ سالنامہ یادگار رضا ۱۴۳۰ھ-۲۰۰۹ء؛ مؤسس الحاج محمد سعید نوری مدظلہ العالی،
(مقالہ: امام احمد رضا اور معاشی نظام) از محمد ہاشم اعظمی مصباحی، طبع ممبئی

۹ روزنامہ انقلاب (ممبئی) ۱ر جنوری ۲۰۱۰ء (مضمون: مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی، ایک لمحۂ فکریہ) از امتیاز مرچنٹ، اسلامی تجارۃ ریسرچ ٹیم ممبئی

10 An Introduction to positive Economics
By:R.G.Lipsey

11 Economics By: Samuelson

12 Modern Banking By: R.S. Sayers Seventh

Edition

13 Indian Banking By: S.K.Ghosh

14 Modern Economic Theory By: K.K. Dewett & A. Chand

15 Sacher Committee Report

۱۶ بلاسودی بینک پر ایک مضمون: ابوذر انصاری، مالیگاؤں

☆ بتشکر: غلام مصطفیٰ رضوی صاحب مالیگاؤں کا ممنونِ کرم ہوں کہ مذکورہ بالا کتابوں میں سے چند کتابیں انہوں نے مہیا فرمائیں۔

☆ بموقع: امام احمد رضا سمینار و کانفرنس ممبئی، منعقدہ ۷/فروری ۲۰۱۰ء

☆ باھتمام: ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی مدظلہ العالی

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی
سابق صدر شعبۂ اردو و ڈین فیکلٹی آف آرٹس
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور، بہار

امام احمد رضا کا اسلوب تنقید
(اردو ادبیات کے حوالے سے)

امام احمد رضا (۱۹۲۱۔۱۸۵۶) نابغۂ وقت اور عبقریِ روزگار تھے۔ ان کا عہد مسعود انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک پر محیط ہے۔ اس میقات میں ایسی جید اور جامع حیثیات و کمالات شخصیت پورے بلاد ہند میں دور دور تک نظر نہیں آتی اور نہ ان کے بعد آج تک منظر عام پر آئی ہے۔ ایسی عظیم المرتبت ہستی جو بیک وقت ۵۵ سے زائد علوم و فنون پر ماہرانہ دسترس رکھتی ہو، آیت من آیات اللہ کہے جانے کی بجا طور پر مستحق ہے۔ دینی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ، طبیعات، کیمیا، ریاضی، الجبرا، علم طبقات الارض اور علم الافلاک وغیرہ میں ان کو جو غیر معمولی مہارت ادراک اور استحضار حاصل تھا، اس کی تو ان کے معاصر علما میں کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔ اس کا احساس و اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جو اس سے فکری و نظری سطح پر کوئی اختلاف رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک شخص نہیں، مستقل ادارہ تھا۔ اور آج ہندو پاک کے کئی اہم ادارے ان کے افکار و نظریات، ارشادات اور تعلیمات کا احاطہ و تجزیہ ہنوز آغاز باب کے مراحل میں ہے۔ مگر یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ کوئے رضا سنسنان نہیں، آباد ہے، دھوم مچانے والے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے تلافیٔ مافات کی کوششیں برگ و بار لائیں گی۔

یہ چند کلمات محض بطور تمہید معرض اظہار میں آگئے ہیں اب میں اپنے موضوع ''امام احمد رضا کا اسلوب تنقید'' کے تعلق سے اپنی محدود فکر و فہم کے مطابق کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا،

تنقید اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں کسی ادب پارے کے محاسن ومعائب، بلند وپست اور خوب وناخوب کے اجاگر کرنے اور تعین قدر کا نام ہے اور بقول آل احمد سرور اس پرکھ میں تعارف، ترجمانی اور فیصلہ سب کچھ شامل ہے۔ مگر اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیز ادارک، زندہ احساس اور وسعت نظر کا ہونا لازمی ہے۔

امام احمد رضا ان تمام اوصاف سے بدرجہ اتم بہرہ ور تھے، ان کے اسلوب تنقید میں بھی حد درجہ سنجید گی، شائستگی اور نفاست پائی جاتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح مذاق اور پرورش ذوق کے لیے یہی انداز مؤثر ترین ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے جہاں کہیں بھی کسی ادبی فن پارہ کے متعلق سے رائے قائم کی ہے، تو ان چیزوں کا حد درجہ لحاظ کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امام احمد رضا نے تنقید کے موضوع پر کوئی مستقل تصنیف نہیں پیش کی ہے یہ ان کا اصل میدان تھا بھی نہیں، لیکن اہل علم وادب کے استفسارات پر شعر وسخن کے الجھے ہوئے مسائل کے تعلق سے جو اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس سے آپ کے بالیدہ تنقیدی ذہن وشعور کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ کے ادبی مزاج اور فنی مطالعہ میں بڑی وسعت، گہرائی، دور بینی اور ژرف نگاہی پائی جاتی ہے۔ آپ کی مختلف کتابوں اور تحریروں میں بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے پر آپ کی تنقیدی نگارشات کا ایک وقیع سرمایہ فراہم ہوسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ادب کا کوئی سنجیدہ مگر محنتی طالب علم اس سمت میں اپنا تحقیقی سفر شروع کرے، قیام مسرت ہے کہ اس موضوع پر عزیز گرامی ڈاکٹر امجد رضا نے P.H.D. کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے، وہیں امام احمد رضا کے تنقیدی سرمایہ کو سمیٹنے کی قابل ذکر کوشش کی ہے، اگر یہ شائع ہوگیا تو امام احمد رضا کے اسلوب تنقید کا احاطہ ومحاسبہ کرنے کے لیے ایک ٹھوس بنیاد مل جائے گی اور اس وقت یہ ذمے دارنہ رائے قائم کرنے میں سہولت ہوگی کہ ان کے ہم عصروں میں حالی وشبلی ہی تنقید کے مرد میداں نہیں، بلکہ امام احمد رضا کی بھی خاموش تنقیدی خدمات کسی سے کم نہیں اور یہ تو سامنے کی حقیقت ہے کہ جب تک ہم اپنی کسی ایجاد و پیداوار کو بازار میں نہیں لائیں گے، چشم خریدار سے وہ بالکل اوجھل اور محروم توجہ رہے گی۔ اب ہم یہاں امام احمد رضا کی تحریروں سے کچھ ایسے شواہد پیش کریں گے، جن سے ان کی سخن فہمی، سخن سنجی، بالغ نظری اور تجزیاتی انداز کے ساتھ ساتھ ان کے شریفانہ اسلوب کی پرتیں کھلتی نظر

آئیں گی۔ اردو کے ایک معروف استاذ شاعر مرزا رفیع سواد ہیں۔ ان کے ایک نعتیہ قصیدہ کی تشبیب کا مطلع ہے

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے تسبیح زنار سلیمانی

جناب شاہ نور عالم میاں صاحب مارہروی نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ اس کی تشریح چاہی، تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ ''ظاہر مطلب شعر جہاں تک شاعر نے مراد لیا ہوگا صرف یہ مناسبت دیکھ لینا چاہیے کہ دانۂ سلیمانی میں جس کی تسبیح عباد وزہاد رکھتے ہیں، شکل زنار موجود ہے، اس کا رکھنا تمغائے فقر قرار پایا ہے، شاعر کہ مذہباً سنی نہ تھا اور بدگمانی تمغائے شعر ہے غالباً اس سے زاید کچھ نہ سمجھا ہوگا اور یہ ایک بیہودہ معنی تھا۔ مگر اتفاقاً اس کے قلم سے ایک لفظ ایسا نکل گیا، جس نے اس شعر کو بامعنی و پرمغز کر دیا۔ یعنی لفظ زنار کہ کفار باندھتے ہیں، زنار زائل ہے کہ ایک جھٹکے میں ٹوٹ سکتا ہے اور دانہ سلیمانی میں اس کی تصویر ثابت ہے کہ جب تک دانہ رہے گا قائم رہے گی۔ کفر دو قسم ہے ایک کفر زائل جو کفر کفار ہے اور جس کی سزا خلود فی النار ہے ہر کافر موت کے بعد اس سے باز آتا ہے دوسرا کفر ثابت جو ابدالآباد تک قائم رہے گا جسے علمادین نے جزو ایمانی فرمایا ہے۔ اب معنی واضح ہو گئے کہ جو کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمان بلکہ جزو ایمان ہے بخلاف کفر زائل۔

یہ ایک ایسی نفیس تشریح ہے کہ مذکورہ شعر سے متعلق اب کوئی اشکال باقی نہیں رہتا اور شعر کی معنویت بھی برقرار رہ جاتی ہے اسی طرح درجہ ذیل شعر کا مطلب دریافت کیا گیا۔

اہل نظر نے غور سے دیکھا تو یہ کہا
کعبہ جھکا ہوا تھا مدینے کے سامنے

آپ نے جواب دیا۔ شب میلاد کعبہ نے سجدہ کیا اور جھکا مقام ابراہیم کی طرف اور کہا حمد ہے اس وجہ کریم کو جس نے مجھے بتوں سے پاک کیا، مختصر الفاظ میں شعر کے مرکزی خیال کو واضح کر کے اس کو بے غبار ثابت کر دینا امام احمد رضا کے ذہن وقاد کا ہی کمال ہو سکتا ہے۔ یہاں پر اس اہم نکتہ کی طرف بھی اہل علم و دانش کی توجہ چاہتا ہوں کہ اردو کی غزلیہ یا عشقیہ شاعری میں محبوب کج

ادا کے لیے لفظ رعنا کا استعمال عام ہے۔ از متقدمین تا متأخرین اکثر شعرا کے یہاں اس کا بلا تکلف استعمال ملتا ہے۔ مگر مزاج شریعت کے اداشناس امام احمد رضا نے اس لفظ کے استعمال کو ناروا قرار دیتے ہوئے سختی سے منع فرمایا ہے ملاحظہ ہو ''البتہ مولانا کافی کے یہاں لفظ رعنا کا اطلاق جا بجا ہے اور یہ شرعاً محض ناروا و بیجا ہے۔ مولانا کو اس پر اطلاع نہ ہوئی ورنہ ضرور احتراز فرماتے۔ حسن میاں مرحوم کے یہاں بفضلہٖ تعالیٰ یہ بھی نہیں، ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتادیے تھے۔

اس اقتباس میں ''ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتادیے تھے'' کا ٹکڑا کمال ادب کے لیے توجہ طلب ہے، اس جملہ سے صاف ظاہر ہے کہ ادب کے معاملے میں امام احمد رضا بھی اصول کے پاسدار تھے، خواہ وہ اصول ان کے اپنے ہی قائم کردہ کیوں نہ ہوں، پھر اشعار کی تشریح کے ضمن میں اصول کی بات کرنا اس بات کی بھی غماز ہے کہ تنقید کے باب میں بھی وہ اصول پسند تھے۔ آپ کے برادر خرد علامہ حسن بریلوی نے جن کا شمار داغ دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے، اپنی غزل کا ایک شعر آپ کو سنایا ؎

خدا کرنا ہوتا جو تحت مشیت
خدا ہو کے آتا یہ بندہ خدا کا

آپ نے فرمایا ''ٹھیک ہے یہ شرطیہ ہے، جس کے لیے مقدم اور تالی (یہ منطق کی دو اصطلاحیں ہیں جو شرط و جزا کے معنی میں ہیں) کا امکان ضروری نہیں' اس کے بعد آپ نے کتاب وسنت اور ارشادات شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حوالے سے اس کی تائید و توثیق میں دریا بہادیے ہیں، در بے بہا دیے ہیں۔ بڑی طویل عبارت ہے، اس کا نقل کرنا طول مبحث کا باعث ہوگا۔ آخر میں خود امام احمد رضا فرماتے ہیں میری اجازت کے بعد حسن میاں مرحوم نے یہ شعر داخل غزل کیا اور مقطع میں اس کی طرف اشارہ کیا کہ ؎

بھلا ہے حسنؔ کا جناب رضا سے
بھلا ہو الٰہی جناب رضا کا

سطور بالا میں امام احمد رضا کی سخن فہمی و نکتہ سنجی سے متعلق ایک اجمالی گفتگو کی گئی ہے، اب ہم لسانی اور عروضی نکتہ نظر سے آپ کی فتوحات کا جائزہ لیں گے۔ ہم عصر شاعر کو جب عروضی اور لسانی سطح

پر کوئی دقت لاحق ہوتی تھی تو بلا تکلف آپ سے ہی رجوع کرتے اور یہ تو ہر دور کا مزاج رہا ہے کہ حل مشکلات کے لیے لوگ متخصصین ہی کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے ایک ہم عصر شاعر چودھری عبدالحمید خاں نے اپنا ایک شعری مجموعہ ''کنز الآخرہ'' کے نام سے مرتب کیا، اس کے بعد اشعار پر ایک عروض داں نے اعتراضات کیے۔ دو شعر اور اس پر اعتراض ملاحظہ ہو۔

ہے وہی خلّاق مخلوقات کا
ہے وہی رزّاق حیوانات کا

اعتراض۔ مخلوقات وحیوانات میں 'ایطا' ہے یوں چاہیے تھا

'ہے وہی رزاق مرزوقات کا۔ شاعر کی طرف سے جواب دیا گیا کہ جمع کے قوافی میں مفرد کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا مستحسن ضرور ہے، لازم نہیں جیسے مولانا روم کا یہ شعر

یا کریم العفو، ستار العیوب
انتقام از مالک اندر ذنوب
پس پیمبر گفت استفتالقلب
گرچہ مفتی شاں بروں گوید خطوب

عیوب وذنوب میں علامت جمع واو ہے، اس کو علاحدہ کر کے دیکھا جائے، تو عیب وذنب کا کافیہ نہ بنے گا، اسی طرح قلوب وخطوب بھی، امام احمد رضا اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ عیوب وذنوب اور قلوب وخطوب کے قوافی سے استشہاد صحیح نہیں کہ کلام جمع سالم میں ہے، فقیر نے بھی یہ کافیہ نہ بدلا تھا کہ ضروری نہ تھا بعد اعتراض، مرزوقات' ہی بنا دینا انسب معلوم ہوا۔ اسی کتاب کا ایک شعر ہے۔

وہ یگانہ ہے صفات وذات میں
نیز یکتا اس کے سب افعال ہیں (ہے)

اس پر اعتراض ہوا کہ ''قافیہ صحیح نہیں'' مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا

نیز یکتا ہے وہ ہر اک بات میں

صاحب کتاب نے یہ جواب دیا کہ

اختلاف حرکت قافیہ میں اساتذہ کی سندیں حدتواتر پر ہیں۔ جیسے اشعار ذیل

چوں خواہد کہ ویراں کند عالمے
نہد ملک درپنجۂ ظالمے

سعدیؔ

کہ صید آزمودست گرگ کہن
چوں خدمت گزار تو گردد کہن
حق سالیانش فرامش مکن
کنونت کہ دست است جاری بکن
دگر کے برآری تو دست از کفن
بخائیدش از کینہ دنداں بہ زہر
کہ دؤں پرورست ایں خرد مایہ دہر
گفت پیمبر بکن اے رائے زن
مشورت کالمستشار موتمن

مولانا روم

(مؤتمن بہ کسرۂ میم ثانی بمعنی امین ہے)

اے زرایت ملکودیں درنازش ودر پرورش
اے شہنشاہ فریدوں فردا سکندر منش
سایۂ حق مست ویارب سایہ اش پایندہ دار
زآنکہ فرض است از میاں بادعائے دولتش

کمال اسماعیل

(منش اور دولتش کا اختلاف اظہر من الشّمس ہے)

اسی طرح حافظ عزالدین مؤلف ''نادر الترتیب'' جو بڑے استاد اور پرانے تجربہ کار شاعر ہیں لکھتے ہیں ۔

چھ سو بارہ شعر، تیرہ فصل، دو باب، اس میں ہیں
تھوڑے تھوڑے حاشیہ پر ہیں لغات ہر باب میں

اب امام احمد رضا اس جواب پر اور اس میں پیش کیے گئے تمام اشعار پر یوں نقد و محاسبہ فرماتے ہیں۔

(الف) ''ہیں اور میں'' کا قافیہ ضرور معیوب ہے ''عالمے اور ظالمے'' پر اس کا قیاس صحیح نہیں کہ روی جب متحرک ہو، تو قبل کی حرکت میں اختلاف بلا اجماع جائز و بے عیب ہے۔ جیسے دلش و گلش''، بخلاف دل و گل کہ روی ساکن ہے، جیسے یہاں یعنی (میں اور ہیں میں)

(ب) کہن بفتح ہا و بضمتین دونوں طرح ہے، جس کی سند یہی اشعار اور ان کی مثال بے شمار ہیں حضرت مولوی قدس سرہ۔

نفس فرعونے ست اور اخوار کن
تنا یارد دیا راز کفر کہن

(ج) جاری بکن غلطی کاتب ہے صحیح خار بکن ہے

(د) زہر و دہر بالفتح ہیں

(ز) حدیث شریف میں مؤتمن بروزن معتمد بفتح میم دوم ہی سے مؤتمن بالکسر امین دارندہ و بالفتح امین داشتہ شدہ۔ یعنی جس سے مشورہ طلب کیا گیا ہے اسے امین بنایا گیا تو خلافِ مشورہ دینا خیانت ہے لہٰذا فقیر کو ان گزارشوں پر جرأت ہے کہ یہی حکم شریعت و مقتضائے امانت ہے''

اس طرح کی لسانی اور عروضی بحثیں آپ کے یہاں بے حد وافر ملتی ہیں ان سب کا احاطہ واندراج یہاں مقصود نہیں ؎

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اتنے ہی نمونوں پر اکتفا کرتے ہوئے عرض پرداز ہوں کہ لسانی اور عروضی نکات و مسائل پر اعلیٰ حضرت کی جو نگاہ تھی، وہ ایک عالم دین اور عالم دین بھی کیسا، عالم تبحر بلکہ بحر العلوم کیلیے نہایت کامیاب شئے ہے اور معاصر وجید ناقدین فن سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فنی محاکمہ اور محاسبہ کرتے ہوئے امام احمد رضا کسی کی رورعیات نہیں کرتے۔ فتاویٰ رضویہ سے جو اقتباس ابھی نقل

کیا گیا ہے، وہ ان معروضات کی تائید وتوثیق کے لیے کافی ہے کہ حضرت ادبی مشورہ ورائے زنی کو بھی نہ صرف مدلل طور پر پیش کرتے ہیں بلکہ اسے ''مقتضائے امانت'' اور ''حکم شریعت'' کے تابع رکھتے ہیں اور اصول امانت کے خلاف اظہار رائے کو خیانت تصور فرماتے ہیں، وہ دوسروں کی صحیح رائے کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ جو ''مرزوقات'' والی منقولہ بحث سے آشکارا ہے۔ اتنی عمیق نظر اور اتنا وسیع شعری وادبی مطالعہ مروجہ علم دینی ودنیاوی کے فقیہ ہونے کی حیثیت کے علاوہ امام احمد رضا کے سوا اُن کے اور کسی ہم عصر کو کب میسر ہے! کمال بالائے کمال یہ ہے کہ جب وہ فن شعر گوئی پر لکھتے ہیں، تو عالم دین کا ذہن بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا یا علامہ حسن بریلوی یا اس طرح کے دوسرے کے اشعار کا محاکمہ کرتے ہوئے وہ ایک نظریہ ساز نقاد کے طور پر صرف تنقید کے لعل وگوہر نہیں لٹاتے، بلکہ حق گوئی کے اس معیار کو اپناتے ہیں، جو مولیٰ تعالیٰ اور اس کے رسول صاحب لولاک کو پسند آئے۔

حواشی

۱۔ فن تنقید اور تنقیدی مضامین مصنفہ پروفیسر نجم الہدیٰ ص ۲۔۷ سے ماخوذ دوسرا ایڈیشن

۲۔ بحوالہ الملفوظ مکمل حصہ اول صفحہ ۳۱۔۳۲۔

۳۔ ؍؍ حصہ اول ص، ۳۱۔۳۲

۴۔ ؍؍ حصہ دوم ص، ۳۹

۵۔ ؍؍ حصہ دوم ص ۳۹۔۴۰۔

۶۔ فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ؍ص ۱۸۳۔

۷۔ فتاویٰ رضویہ دوازدہم ص ۱۸۰۔۱۸۳۔

پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم احمد منعمی
سجادہ نشین خانقاہِ منعمیہ، میتن گھاٹ پٹنہ سٹی
صدر شعبۂ عربی اورینٹیل کالج، پٹنہ سٹی، پٹنہ

امام احمد رضا اور بہار کی خانقاہیں

بہار میں بھی سید احمد بریلوی کی آمد سے پہلے اعمال اور عقائد میں جملہ مسلمانوں کے نہ کوئی اختلاف تھا اور نہ انتشار، نہ کوئی کسی کے درپئے آزار تھا اور نہ کسی کو کسی سے کوئی مسلکی تنفر۔ چھٹی صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری تک مختلف سلاسل کی خانقاہیں راہ سلوک کی راہ روی میں مصروف تھیں۔ چشتیوں، فردوسیوں، نقشبندیوں اور قادریوں میں باوجود فرق نصاب نہ تو مناظرہ تھا اور نہ کوئی مناقشہ۔ صلوٰۃ وسلام، میلاد مع قیام، عرس وفاتحہ، ایصال ثواب بلا فرق سلاسل ہر خانقاہ اور ہر فرد کا محبوب مشغلہ تھا۔ ندائے یارسول اللہ حرز جاں تھا اور یا شیخ عبدالقادر شیأ للہ وظیفہ مجرب تھا۔ بوعلی شاہ قلندکی سہ منی، شیخ احمد عبدالحق کا توشہ، توشہ غوث پاک، ختم خواجگان، محرم کے کھچڑے، شب برأت کے حلوے پر عید کی سوئیوں کی طرح بلا شک وتردد سب کا عمل تھا۔ سید احمد بریلوی اور ان کے شاگرد رشید مولوی اسماعیل صاحب دہلوی کی تحریک جہاد دراصل اسی اتفاق واتحاد اُمت کے خلاف تھی اور بغیر اس نفاق واضطراب کے دوسو برسوں تک انگریزوں کے پاؤں جمانے اور مسلمانوں کو صدیوں تک پیچھے دھکیلنے کا نشانہ پورا کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ ان کی مساعئ قبیحہ کا منشور تقویۃ الایمان کی شکل میں تضعیف الایمان کا سبب بنا اور مولوی اسماعیل دہلوی فیل مست خرام کی طرح اپنی پشت پر سید احمد بریلوی کا ہودج لیے اتحادِ اُمت کو دور تک روندتے چلے گئے۔

بہار میں بھی سیاسی ابتری کے موسم میں آئے ہوئے اس فکری سونامی نے ساحل فکر پر شغل کرنے والوں کو اپنا ہی لیا چنانچہ نمو ہیہ، پٹنہ کی ایک قدیم خانقاہ جس کی بنیاد گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں حضرت ابوالبرکات محمد فایض نے ڈالی تھی اور وہ مشہور محدث وصوفی حضرت مولانا شہباز محمد بھاگلپوری کے عزیز قریب اور خلیفہ تھے اور جہاں اعراس کی مجالس اپنے اسلاف کی روش پر صدیوں سے جاری

تھیں، ان کے چپیٹ میں آ گئی اور اس کے فی زمانہ سجادہ نشیں شاہ محمد حسین، سید احمد بریلوی صاحب کے دام جہاد میں گرفتار ہو گئے اور ان کے صادقپوری اعزہ و مریدین بھی اسی رنگ میں ڈوب گئے اور اس طرح بہار میں سید احمد بریلوی اور ان کی تحریک کو ایک مضبوط مرکز حاصل ہو گیا۔ خانقاہ کی زمینیں اور وسائل واقف کی منشا کے خلاف سید احمد رائے بریلوی صاحب کی مرضی کے مطابق خرد برد ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔

اس سونامی سے بہار کی ایک علمی خانقاہ جسے پٹنہ ضلع میں حضرت مخدوم جہاں خلیفہ حضرت مخدوم منہاج الدین راستی کے قدموں میں آباد ہونے کا شرف حاصل تھا، اس کے بانی خانقاہ حضرت مولانا شاہ مجیب اللہ قادری کو ان کے پیر و مرشد تقبیل ابہامین کا طریقہ و وظیفہ تلقین فرماتے تھے اور جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تقریب و نیاز کے لیے شغل درود کا طریقہ رائج تھا اور جہاں سید صاحب مع مولوی اسماعیل دہلوی ایک بار فی زمانہ صاحب سجادہ سے ملنے حاضر ہوئے، تو اس خاندان میں بھی پتھل مچا کر لوٹے، چنانچہ خاندان مجیبیہ کے ایک فرد بلکہ خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشیں حضرت مولانا شاہ محمد ظہور الحق پھلواری سے متعلق حکیم شاہ محمد شعیب پھلواری لکھتے ہیں:

''علامہ (شاہ محمد ظہور الحق عمادی مجیبی پھلواروی) مذکور اس فعل (تعبیل الاظفار فی الاذان عند شہادۃ اشہد ان محمد رسول اللہ) کو بدعت قبیحہ بلکہ قریب بکفر جانتے تھے''۔ (حیات فرد، ص:۲۲)''

خانوادہ مجیبیہ میں اہل پھلواری نے فوراً کوئی اثر نہ قبول کیا ہو یہ درست ہو سکتا ہے، لیکن ان سے یہ سہو تو ہو ہی گیا کہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اساتذہ اسی تحریک کے افراد میں سے منتخب کیا، جس کی اس قدر قیمت چکانی پڑی کہ حکیم محمد شعیب پھلواروی لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ محمد عین الحق، حضرت (علی حبیب) نصر قدس سرہ (پیر مجیب کے اپنے پر پوتے) کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ۱۲۸۷ھ میں پیدا ہوئے، ۱۰ر سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالحق قدس سرہ کی وفات کے بعد جانشیں کیے گئے، درسیات مولوی حکیم علی نعمت سے تمام کیں۔ مولوی حکیم علی نعمت، مولوی عبداللہ غازی پوری کے شاگرد اور مذہباً غیر مقلد تھے۔ شاہ عین الحق استاذ کی تعلیم سے متاثر ہوئے اور حنفی مسلک کو چھوڑ کر غیر مقلد ہو گئے۔ ۱۳۰۹ھ میں ترک سجادگی کر کے موضع حکیم آباد گھگھٹہ ضلع چھپرہ جہاں آپ کی سسرال تھی، اقامت اختیار کر لی۔ (اعیان وطن، ص:۲۸۲-۲۸۱)

مذکورہ تحریکِ نفاقِ اُمت کے اثرات باڑھ ضلع پٹنہ کے باوقار علمی و صوفی خانوادے پر بھی پڑا۔ شادی اس کی وجوہات میں یہ بھی ایک بڑی وجہ تھی کہ اس خانوادہ کی رشتہ داریاں خاندان صادقپور سے بھی تھیں جو کہ پورا کا پورا سید احمد بریلوی کا لقمہ بن چکا تھا۔ یہ خانوادہ حضرت ملا غلام یحیٰ بہاری کا خانوادہ

تھا۔ ملا غلام یحیٰ بہاری (م ۱۱۸۶ھ) بارہویں صدی ہجر کے جید علما و صوفیہ میں سے تھے۔ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کی گراں قدر تالیف شرح آداب المریدین پر آپ نے نہایت وقیع حاشیہ ثبت فرمایا جو ہنوز بے مثال ہے۔ ملا غلام یحیٰ بہاری کے دونوں بیٹے ملا جمال الحق اور ملا کمال الحق کو بیعت و استفادے کا شرف حضرت قطب العالم مخدوم شاہ محمد منعم پاکباز سے حاصل تھا۔ ملا جمال الحق اور ملا کمال الحق کے پوتوں میں اکرام الحق، واعظ الحق وغیرہ، سید احمد بریلوی سے بیعت ہو گئے۔ اکرام الحق تو اس قدر معتقد ہوئے کہ اپنے نومولود بیٹے کو مولوی اسماعیل دہلوی کا ہم نام کر دیا، چنانچہ مشہور محقق اور قاضی عبدالوحید فردوسی کے بیٹے قاضی عبدالودود کے کہنے سے رکھا گیا وہ ان کی ولادت کے زمانے میں پٹنہ آئے ہوئے تھے۔'' (مقالات قاضی عبدالودود، ص:۴)

تب کون جانتا تھا کہ تاریخ پھر ایک بار اولاد اسماعیل سے ہی کارنمایاں درج کرے گی چنانچہ یہی قاضی اسماعیل خود لکھتے ہیں:

''میں بخار کی بیماری میں اس طرح مبتلا ہوا کہ تقریباً ڈیڑھ سال تک مجھے بخار آتا رہا اور میں اس قدر کمزور و نحیف ہو گیا کہ کسی کو میری زندگی کی امید باقی نہیں رہی۔ اطبا نے بھی جواب دے دیا، آخر کار میں حضرت مخدوم منعم قدس سرہ کے مزار مبارک پر اس عزم کے ساتھ چلہ کھینچا کہ اگر میں (آپ کی دعاؤں سے) صحت یاب ہو جاؤں گا، تو (اسماعیل دہلوی کا وطیرہ و طریقہ ترک کر کے) آپ کے طریقے میں داخل ہو جاؤں گا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی، تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ حضرت مخدوم شاہ منعم قدس سرہ کے سلسلے میں داخلے کے لیے کس کی طرف رجوع کروں......'' (اخبار الاولیاء، ص:۱۰)

قاضی محمد اسماعیل کی نظر انتخاب عالم پناہ شخصیت حضرت سید شاہ مبارک حسین منعمی زیب سجادہ حضرت مخدوم منعم پاک پر پڑی اور انہیں سے تعلیم و استفادہ فرما کر خرقہ خلافت پہنا اور اس طرح قاضی محمد اسماعیل نامورسنی قاضی عبدالوحید فردوسی کے حقیقی دادا بنے۔

حضرت مخدوم منعم پاک کی خانقاہ سید احمد بریلوی کے طوفان نفاق اُمت سے نپٹنے کے لیے کس طرح فعال بنی رہی، اس کا ایک روحانی طریقہ آپ نے بھی ملاحظہ فرمایا، اب ایک تربیتی طریقہ تصلب فی الدین کے حوالے سے ملاحظہ فرمایئے کہ قاضی محمد اسماعیل مذکور کے پیر و مرشد حضرت سید شاہ مبارک حسین منعمی کے والد ماجد اور پیر و مرشد جنہیں سلسلہ منعمیہ میں اعلیٰ حضرت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی قطب العصر سید شاہ قمر الدین حسین منعمی عظیم آبادی قدس سرہ (معاصر سید احمد بریلوی) نے حلقہ تعلیم و تربیت میں شمولیت کے لیے یہ شرط لازم فرما دیا تھا کہ:

''آپ متقدمین اہل سنت والجماعت کے مذہب پر تھے اور اگر کسی میں مذہب کی خامی یا کجی

ملاحظہ فرماتے، تو جب تک وہ اہل سنت والجماعت کے مطابق اپنے عقائد درست نہیں کر لیتا، اسے اپنی پاکیزہ محفل میں شریک نہیں فرماتے'' (اخبار الاولیاء، ص:۵۵)

اور جسے آپ عقیدے کی کجی کی وجہ سے ٹھکرادیتے، وہ اگر کسی دوسرے مشائخ کے یہاں عقیدہ چھپا کر یا نادان وسعت قلبی کے حوالے سے جا بھی پہنچا تو ہوا یہ:

''بہت سے لوگ آپ سے طالب فیضان ہوئے، لیکن انہیں آپ نے حلقہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی نتیجتاً انہوں نے دوسرے مشائخ کی طرف رجوع کیا، لیکن تب بھی اس سلسلے میں ان کو ترقی نصیب نہیں ہوئی۔'' (اخبار الاولیاء، ص:۵۵)

قاضی محمد اسماعیل قدیمی کے اندر سلسلہ منعمیہ کی پناہ نے کیا فوائد مرتب کیے اس کا اندازہ قاضی اسماعیل کی اس وصیت سے ہوسکتا ہے جو قلمی صورت میں خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو اس وصیت کا اقتباس جو سید احمد بریلوی کے محبوب مرید کا بیٹا کر رہا ہے اور جس کا نام اسماعیل دہلوی کے نام پر تبرکاً رکھا گیا ہے ع

اللہ اللہ چہ جمال است این بدیع العجبی

''بزرگوں کے مزارات مثلاً بغداد شریف، کربلائے معلیٰ و اکبرآباد و اجمیر شریف کی زیارت کرو اور ہرگز اس زیارت کو ممنوع مت سمجھو کہ دونوں جہان کا نفع اس میں حاصل ہوگا اور اپنے پیران اور اجداد کی ارواح کے لیے فاتحہ پڑھو کہ ان کا حق ادا کرنے کے ضمن میں ثواب پہنچانا بہتر ہے۔

آج کل ہر شخص بزعم خود دعویٰ اجتہاد اور تحقیق رکھتا ہے اور علمائے ظاہر میں ایسی خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ منکر تقلید ہوگئے ہیں اور بزرگوں کے مزارات کی زیارت تو دور رہی، خود روضۂ اطہر کی زیارت سے منع کرتے ہیں۔ اللہ کے ولیوں کی طرف متوجہ ہونے کو بتوں کی پرستش اور متوجہ ہونے والے کو مشرک قرار دیتے ہیں اور یہ ساری چیزیں اہل سنت والجماعت کے صالح اسلاف کے عقائد کے خلاف ہیں''۔ (اخبار الاولیاء، ص:۱۵)

یہی وہ خانقاہ منعمیہ ہے کہ جہاں شب و روز کی حاضر بدعقیدگی سے خوش عقیدگی کا سفر یخرج الحی من المیت پڑھ پڑھ کر کرا رہی ہے اور قاضی اسماعیل قدیمی عظیم آبادی کا پوتہ قاضی عبدالوحید فردوسی المنعمی صحیح العقیدگی کا شہہ سوار بن رہا ہے۔ حضرت مولانا سید شاہ مبارک حسین منعمی عظیم آبادی کے صاحبزادہ حضرت مولانا سید شاہ عزیز الدین حسین منعمی قمری، سجادہ نشیں آستانہ حضرت مخدوم منعم پاک کی مجلسوں میں حاضری وصحبت نے نہ صرف قاضی عبدالوحید کو امام احمد رضا فاضل بریلوی اور ان کے مشن کی خدمت کے لیے کمر بند کر دیا ہے، بلکہ وہ فضا بنا دیا ہے کہ جب

۱۳۱۸ھ/۱۹۹۰ء میں ندوی فکر کے خلاف بہار میں نوبت شمار پہنچی، تو فی صد ۹۹ کے مقابلے ایک رہ گیا۔

بہار کی خانقاہوں میں بدعقیدگی کے خلاف بڑی بیداری اور یکتائی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں علمائے بدایوں ورام پور و بریلی وخیر آباد ہی کی طرح فکری وعلمی پشتہ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ قاضی عبدالوحید فردوسی سرگرم تھے، جب انہیں معلوم ہوا کہ جس منزل کا میں دیوانہ ہوں اس نشانہ کا ایک فرزانہ بھی ہے تو باہم خط وکتابت ہوئی اور پٹنہ قاضی عبدالوحید فردوسی اور امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے قرآن السعدین کا گواہ بنا اور ۱۳۱۸ھ میں اس اتحاد واتصال کی جولانی اظہر من الشمس ہوگئی۔

۱۳۱۸ھ میں مدرسہ اہل سنت پٹنہ کے امتحان کے موقع پر ۷/رسے ۱۳/رجب تک چلنے والے جلسے میں جو دربار حق وہدایت لگا، اس پر ایک نظر ڈالیں، تو تقریباً بہار کی تمام اہم خانقاہیں باہم متفق ومتحد اور بیک آواز نظر آتی ہیں، میں ان خانقاہوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔

خانقاہ معظم بہار شریف

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی مشہور زمانہ عظیم الشان خانقاہ جس کی عظمت وبزرگی دنیائے اسلام کے نقشے پر نصف آٹھویں صدی ہجری سے نمایاں ہے۔ ۱۳۱۸ھ کے جلسے میں بجا طور پر مسند صدارت کو زینت بخش رہی تھی۔ فی زمانہ صاحب سجادہ خانقاہ معظم حضرت جناب حضور سید شاہ امین احمد ثبات بہاری جید عالم، قادر الکلام فارسی وار دو شاعر اور مرشد کامل تھے۔ بہار کی تمام خانقاہیں نہ صرف نسبت مخدوم جہاں کی وجہ کر بلکہ ان کی ذاتی لیاقت وصلابت دینی کی وجہ کر ان کی امامت میں بہ نیت اقتداجمع ہوگئی تھیں۔ حضرت جناب حضور شاہ امین احمد فردوسی نے جن تین شیوخ سے استفادہ فرما کر خرقۂ خلافت پہنا تھا، ان تینوں نے انہیں حضرت مخدوم منعم پاک کے مشرب منعمی کا جام بھر بھر کر پلایا تھا، چنانچہ آپ کی ذات فردوسیت ومنعمیت کا مجمع البحرین بن گئی تھی۔ قاضی عبدالوحید فردوسی انہیں کے مرید اور دست گرفتہ تھے۔ حضرات ندویہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر اپنے دامن الٹ اور پلٹ کر ظاہر وباطن کی پاکیزگی کی قسمیں کھا رہے تھے، لیکن جو نگاہیں لوح محفوظ دیکھا کرتی ہیں، ان پر شیطان کا موتیا کیا چھا سکتا ہے۔

بقیۃ الاولیاء امین احمد امین حمود
شمائلہ تذکرنا الصحابہ سحائبہ علی کل تجود

خانقاہ منعمیہ قمریہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی

حضرت قطب العالم سیدنا مخدوم شاہ محمد منعم پاک اور اعلیٰ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین عظیم آبادی کی خانقاہ عالم پناہ، جو قاضی عبدالوحید فردوسی عظیم آبادی کے آبا واجداد کے پیران ومشائخ کی

آماجگاہ رہی ہے۔ حضرت مخدوم منعم پاک (م ۱۱۸۵ھ) کے ذریعہ سلسلہ منعمیہ کے غیر معمولی فیضان نے متعدد خانقاہوں کا قیام عمل میں آیا اور ان خانقاہوں کے وجود نے سید احمد بریلوی کے طوفان سے ملت کو بڑی خوبیوں سے پناہ بخشنے کا فریضہ انجام دیا اور حضرت مولانا سید شاہ عزیز الدین حسین قمری المنعمی عظیم آبادی قدس سرہ کی قیادت وسیادت میں تحفظ عقائد مبارکہ اور دفع عقائد مفاسدہ کی مہم حضرت فاضل بریلوی کی پٹنہ آمد سے پہلے ہی اس قدر بالغ وشاداب ہو چکی تھی کہ اسی مجلس اہل سنت پٹنہ کی دعوتِ بلیغ پر بریلی وبدایوں وغیرہ کے علما نے بہار میں خوش عقیدگی کی بہار دیکھنے تشریف لاتے تھے۔

۱۳۱۴ھ کی مؤلفہ ''فک فتنہ از بہار و پٹنہ'' میں خانقاہ منعمیہ میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی کی سرکردگی کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت فاضل بریلوی، قاضی عبدالوحید فردوسی کی معیت میں تین بار مختلف موقع سے بارگاہ منعم پاک میں حاضر ہوئے اور خانقاہ منعمیہ میں تشریف لا کر صاحب سجادہ سے ملاقات فرمائی۔ قصیدہ آمال الابرار کا یہ مصرع اس تعلق کی خوب غمازی کرتا ہے ع

عزیز الدین ذا عز یسود

۱۳۱۸ھ میں جو عظیم الشان عدیم المثال جلسۂ علماء مشائخ پٹنہ میں منعقد ہوا، وہ بھی حضرت مخدوم معنم پاک کے عرس کا موقع تھا ۱۱ر و ۱۲ر رجب المرجب ۱۳۱۸ھ کو حضرت مخدوم منعم پاک کے ۱۳۳ر ویں عرس مبارک کے موقع پر ان تمام علماء بدایوں و بریلی و رام پور وغیرہ وغیرہ کی شرکت نے عجیب کیف وسرور پیدا کیا، جس کے چرچے میں نے بار ہا اپنے دادا حضرت فخر الواصلین سید شاہ محمد منظور منعمی سے سنے ہیں۔ اس جلسے کی تیاری میں خانقاہ منعمیہ اور سلسلہ منعمیہ ابوالعلائیہ کی دوسری خانقاہوں نے دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح معاونت فرمائی۔ خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ سے جلسے کے لیے دریاں، توشک، تکیے اور روشن دان تک بھیجے گئے اور جلسہ کو ہر قیمت پر کامیاب بنایا گیا۔

سلسلہ منعمیہ کے ایک گل سرسبد حضرت مولانا شاہ مخلص الرحمٰن جہانگیر منعمی ابوالعلائی قدس سرہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں باضابطہ رسالہ تالیف فرمایا اور ان کے خلیفہ حضرت سکندر شاہ صاحب نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔

خانقاہ منعمیہ میتن گھاٹ، پٹنہ سے امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ اور ان کے خانوادے سے کیسا اور کس قدر تعلق رہا ہے، اس کا اندازہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے وصال پر فاتحہ چہلم و دستار بندی کا خاص دعوت نامہ بھی سب سے پہلے حضرت مولانا شاہ حامد رضا خاں صاحب قدس سرہ نے ہمارے جد اعلیٰ حضرت مولانا سید شاہ عزیز الدین حسین منعمی قدس سرہ کے نام بھیجا اور جب حیات اعلیٰ حضرت، حضرت ملک العلما مرتب

فرمانے لگے، تو یہی دعوت نامہ بطور یادگار مستعار لے کر شامل کتاب فرمایا۔

یہ عاصی پر معاصی حضرت سید شاہ عزیز الدین حسین قدس سرہ کا کپوت اور اسی خانقاہ منعمیہ کے متبرک سجادہ کی خدمت پر مامور ہے۔

خانقاہ بلخیہ، رائے پورہ، فتوحہ، پٹنہ

یہ حضرت مولانا مظفر بلخی کے جانشیں حضرت مخدوم حسین بن معز نوشہ توحید بلخی فردوسی قدس سرہ کے اولاد کی خانقاہ ہے اور تیرہویں صدی ہجری کے اوایل سے پٹنہ کے رائے پورہ، فتوحہ میں مصروف خدمت ہے۔ اس خانقاہ کے بانی حضرت مولانا سید شاہ تقی بلخی، حضرت مخدوم منعم پاک کے خلیفہ وصاحب سجادہ حضرت مولانا سید حسن رضا منعمی رائے پوری کے داماد وخلیفہ تھے اور ان کے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ علیم الدین بلخی منعمی رائے پوری، اعلیٰ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین منعمی کے خلیفہ وخرقہ یافتہ تھے۔ ۱۳۱۸ھ کے جلسۂ اہل سنت میں ان کے صاحبزادے اور جانشیں حضرت مولانا غلام مظفر بلخی اور پوتے حضرت شاہ درگاہی اخلاص ومحبت سے پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حکیم شاہ علیم الدین بلخی فردوسی المنعمی اس خانقاہ کے موجود سجادہ نشیں ہیں۔

خانقاہ چشتیہ عظیم آباد، پٹنہ

عظیم آباد کے دیوان محلّہ کی خانقاہ چشتیہ دراصل نو آباد خورد (ہرداس بیگہہ، پٹنہ) سے نقل مکانی کے بعد قائم ہوئی تھی۔ نو آبادہ خورد میں مخدومہ بی بی کمال (کاکو جہان آباد) کی اولاد میں ایک مرتاض بزرگ حضرت مخدوم اخوند شیخ کی خانقاہ باکمال تھی اور سلسلہ چشتیہ کا فیضان جاری تھا۔ ان بزرگوں کو بارہویں صدی ہجری میں سلسلہ منعمیہ کا فیضان بھی حاصل ہوگیا اور یہی رنگ غالب آگیا تھا۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشیں حضرت شاہ نصیر الحق چشتی بھی حضرت مولانا سید شاہ عزیز الدین حسین منعمی قدس سرہ کے شانہ بشانہ ۱۳۱۸ھ کے جلسے میں سرگرم تھے۔ اب یہ خانقاہ ویران وخاموش ہوچکی ہے۔ نو آبادہ میں درگاہ شریف باقی ہے۔

خانقاہ سجادیہ ابوالعلائیہ، داناپور، پٹنہ

خانقاہ سجادیہ ابوالعلائیہ، داناپور حضرت مولانا شاہ محمد قاسم داناپور اور حضرت مخدوم شاہ محمد سجاد داناپوری کی یادگار ہے۔ یہ دونوں پاکیزہ برادران اپنے زمانے کے شیوخ کاملین میں سے گزرے ہیں اور ان دونوں کو اعلیٰ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین منعمی عظیم آبادی سے اجازت وخلافت تعلیم وتربیت حاصل تھی۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری اول الذکر کے برادرزادے اور ثانی الذکر کے صاحبزادے تھے۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری اپنے بلند اقبال صاحبزادے حضرت شاہ محمد محسن داناپوری کے ساتھ ساتھ خوش

عقیدگی کے تحفظ و وبقا میں اخلاص کے ساتھ شریک فرماتےتھے ۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ان کے اس تعاون کو قاضی عبدالوحید کے ذریعہ قصیدہ ' آمال الابرار آلام الاشرار' میں یوں زندہ جاوید فرماتے ہیں ۔

ومحسننا لاکبر ناولید

آج کل حضرت شاہ محسن داناپوری کے پر پوتے جناب شاہ سیف اللہ ابوالعلائی موجودہ سجادہ نشیں ہیں اوراسی خانقاہ کی ایک شاخ الہٰ آباد میں میں خانقاہ حلیمیہ ابوالعلائیہ کے نام سے مقبول خاص وعام ہے، جس کے سابق سجادہ نشیں حضرت مولانا حکیم سید شاہ عزیز احمد حلیمی ابوالعلائی مشہور زمانہ مقرر گزرے ہیں اوران کے بلند اقبال صاحبزادے مولانا سید شمیم گوہر علمائے اہل سنت میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

خانقاہ شعیبیہ شیخ پورہ

حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسی کی عظیم خانقاہ شیخپورہ بہار میں ہنوز قائم ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں یہاں بھی منعمی ابوالعلائی سلسلہ کا فیضان تازہ گرمی تاثیر کا باعث بنا اور حضرت مخدوم شاہ حسن علی منعمی اور حضرت مخدوم شاہ یحیٰ علی منعمی صفی پوری کی نسبتیں خانقاہ شعیبیہ کے صاحب سجادہ میں رچ بس گئیں۔ حضرت مولانا شاہ جمال علی شعیبی کے جانشیں حضرت مولانا شاہ وحید الحق شعیبی منعمی بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے شانہ بہ شانہ ۱۳۱۸ھ کے جلسے میں بدعقیدگی کے رد میں کوشاں نظر آتے ہیں۔

خانقاہ بارگاہ عشق، پٹنہ سٹی

حضرت مخدوم منعم پاک کے جید خلیفہ حضرت خواجہ شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کی خانقاہ بارگاہ عشق بھی ۱۳۱۸ھ کے جلسے میں پیش پیش تھی۔ اس کے سجادہ نشیں حضرت خواجہ شاہ امجد حسین عرف شاہ امیر صاحب ابوالعلائی کا تعاون بھی خاصہ نمایاں تھا۔خواجہ شاہ رکن الدین احمد موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف

حضرت مولانا شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواری کی خانقاہ پھلواری شریف میں مشہور معروف رہی ہے۔حضرت مولانا شاہ بدرالدین مجیبی پھلواری، اعلیٰ حضرت فاضل بریلی سے نہ صرف متفق تھے بلکہ مخلص ومعاون بھی تھے ان کے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محی الدین مجیبی پھلواری ۱۳۱۸ھ کے جلسے میں شریک تھے۔قصیدہ آمال الابرار اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

بفلواریہ محی الدین ورد

لبدر سمائہا نجم حرید

حضرت مولانا شاہ ولایت علی قادری منعمی اسلام پوری کی خانقاہ قادریہ بھی اعلیٰ حضرت فاضل

بریلوی کے ساتھ ساتھ تھی۔ بانی خانقاہ کے نواسے اور فی زمانہ سجادہ نشیں مولانا عبدالقادر منعمی اسلام پوری بھی خوش عقیدگی کے سفر میں رفیق مخلص تھے ان کے داماد شاہ صبیر الحق بھی معاونین میں نمایاں تھے۔

خانقاہ اصدقیہ پیر بگیہہ شریف

حضرت مولانا سید شاہ قیام اصدق چشتی بہار میں سلسلہ چشتیہ کے متاخرین بزرگوں میں نہایت مقبول گزرے ہیں، ان کے صاجزادے حضرت مولانا حافظ شاہ شہود الحق صاحب فخری اصدقی بھی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ہمنوا تھے۔ ان کا بھی سرگرم تعاون مجلس اہل سنت پٹنہ کو حاصل تھا۔ حضرت سید شاہ مشہود اصدق اصدقی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

خانقاہ جڑھوا، حاجی پور

خانقاہ جڑھوا میں ماموں بھانجہ کی درگاہ مشہور ومعروف ہے، اس درگاہ کی سجادہ نشینی پر ایک قدیم خاندان پشتہا پشت سے فائز چلا آرہا تھا۔ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں حضرت سید شاہ محمد حسین ایک نمایاں سجادہ نشیں ہوئے جنہیں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بھی استفادے کا شرف حاصل تھا۔ ان کا تعاون بھی تحریک اہل سنت پٹنہ کو خوب خوب حاصل رہا۔ یہاں یہ بات بھی عرض کردینا ضروری ہے کہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے جتنے مرید ومعتقد پٹنہ واطراف پٹنہ میں تھے، سب کے سب اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ہمنوا تھے۔ یہ بات اس لیے بھی بڑی قابل غور ہے کہ مولوی محمد علی مونگیری بھی انہیں کے خلیفہ تھے، لیکن خوش عقیدگی کے عنوان پر ان کے تمام معروف مربا ین بجائے پیر بھائی، اعلیٰ حضرت کے رفقائے مخلصین میں سے تھے جن میں سے چند کے نام بار بار دربار حق وہدایت میں آتے رہے ہیں مثلاً: سید شاہ محمد کمال صاحب، سید شاہ احمد حسین رئیس جڑھواہ، سید شاہ محمد اقبال صاحب رئیس پٹنہ، وغیرہ وغیرہ

خانقاہ بیتھو شریف، ضلع گیا

گیا کے بیتھو شریف میں حضرت مخدوم درویش اشرف چشتی قدس سرہ کی خانقاہ قدیم اور مستند ہے۔ حضرت مخدوم درویش، مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے خلیفہ وبرادرزادے حضرت شاہ عبدالرزاق نورالعین کی اولاد میں مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے معاصرین میں خانقاہ بیتھو کے سب سے مشہور فرد حضرت مولانا شاہ کریم رضا صاحب بیتھوی، تحریک اہل سنت کے مخلص رفیق تھے۔ انہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔

ان خانقاہوں کے علاوہ کئی ایسی خانقاہوں کے مشائخ بھی بدعقیدگی کے خلاف تحریک اہل سنت پٹنہ کے دوش بدوش تھے، جن کی خانقاہیں زمانہ حال میں مٹ چکی ہیں، نقل مکانی کرچکی ہیں۔ جن کے تفصیلی ذکر

کے لیے یہ مقالہ ناکافی ہے۔ بہار میں خانقاہوں کا یہ اتحاد واتفاق سوادِ اعظم کے لیے بڑا نیک فال ثابت ہوا۔ مدرسہ حنفیہ کی بنیاد پڑی اور حضرت محدث سورتی کی صدارت میں اس مدرسہ میں درس وتدریس کا آغاز ہوا، تو اس سے بڑی امیدیں پیدا ہوئیں، ساتھ ہی ساتھ تحفۂ حنفیہ کا اجرا ہوا، جو اس وقت پورے برصغیر میں اہل سنت والجماعت کا سب سے مؤقر، مستند اور مقبول رسالہ تھا، لیکن یہ سب کچھ قاضی عبدالوحید فردوسی (اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت وکرم فرمائے آمین) کے رخصت ہوتے ہی ایسا لگا جیسے خلیفہ کے ہاتھ سے مبارک انگشتری گر پڑی اور سب کچھ جاتا رہا۔ لیکن کل کی سینہ سپر خانقاہیں آج بھی خوش عقیدگی کا زندہ وتابندہ مرکز ہیں اور رہیں گی انشاءاللہ بلکہ خوش آئند بات یہ ہے کہ جو کل تذبذب میں تھے وہ بھی آج تصلب کی دولت سے مالا مال ہیں۔ **فالحمدلله علی ذلک۔**

پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین
شعبۂ اُردو رانچی یونیورسٹی، رانچی، جھارکھنڈ

امام احمد رضا......بحیثیت مفکر

قدرت کا ایسا نظام رہا ہے کہ ہر دور میں اُمت کی اصلاح کے لیے انبیائے کرام کے بعد ایسے مصلحین، مجددین کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا کیا، جنہوں نے اپنے علم وحکمت اور مصلحانہ صلاحیتوں سے محیر العقول خدمات انجام دیے ہیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ان کی شخصیت اس ہشت پہل ہیرے کی مانند ہے جس کا ہر پہلو درخشاں، روشن اور نیر تاباں ہے۔ یہ وہ دیدہ ور شخصیت ہے، جو بڑی مشکل سے چمن میں پیدا ہوتی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام میں پیر کارواں کا مقام عطا کیا۔ وہ ایک جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے اور علم وفضل فکر وآگہی، حکمت ودانائی، تعلق الی اللہ، فنافی الرسول، تفقہ فی الدین کے اعتبار سے نہ صرف ملت، اُمَت، ملک، عالم اسلام بلکہ عالم انسانیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ آپ نے جس میدان میں قلم کی جولانیاں دکھائیں وہاں منفرد وممتاز رہے۔ ستر (۷۰) علوم وفنون پر ایک ہزار سے زائد کتابوں کا مصنف حضرت امام احمد رضا نے انسانیت اور خاص طور پر مسلمانوں کی علمی ومذہبی ترقی کے لیے اہم خدمات انجام دیے ہیں۔ ان کی تصنیفات مسلمانوں کے ذہنی سانچے کو درست کرنے اور ان کے اندر بصیرت اور عزیمت پیدا کرنے کے لیے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ساتھ ہی فکر کی بلندی اور علم کی روشنی، روح حیات کی چاشنی اور زبان وقلم کے حسن کا مرکب ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہے، جن کے قلب پر افادات قرآنی کا القا ہوتا تھا۔ ایک بلند نگاہ عالم دین اور دیدہ ور مفکر کی حیثیت سے قرآن عزیز کی حیرت انگیزی اور اعجاز بیانی پر غور کیا۔ شاہکار ترجمہ ''کنزالایمان'' میں آیات سے استدلال اور ان کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے قرآن کے اعجاز کو خوب آشکارا کیا۔ قرآن کے اسالیب، تعبیرات اور الفاظ کے مواقع استعمال کی بلاغت واضح کی۔ لغوی، لسانی، تشریحات کے علاوہ ترجمہ کی نزاکتوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی۔ بعض الفاظ کی ایسی دلنواز اور دلگداز تشریح ووضاحت کی کہ قرآن مجید کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کیفیت سے

آشنائی ہوتی ہے جو لفظ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیت سے بڑی مطابقت رکھتی ہے۔ یہاں میں مشت نمونہ از خروارے کے طور پر چند مثالوں پر اکتفا کروں گا تا کہ ''کنز الایمان'' کے مصنف کے انداز ترجمہ وتشریح کی بخوبی وضاحت ہو سکے۔ یوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ بہت سارے مترجمین نے کیے ہیں اور ہر ایک کا انداز تحریر یہ ہے۔

''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم دل اور مہربان ہے''

لیکن ہمیں کہنے دیجئے کہ ترجمہ نگار کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ لفظ کے مغز پر تدبر کرے، اس کے پس منظر پر غور کرے تا کہ بلاغی پہلو واضح ہو سکے۔ مثلاً اسی آیت کے ترجمے میں حضرت امام احمد رضا اس نکتے کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کہ اللہ جو خود اپنے متعلق یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اول بھی ہے اور آخری بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی لہٰذا ترجمے میں بھی اس نقطہ کو پیش نظر رکھا جائے کہ ایک طرف پڑھنے والے کے ذہن پر تاثر بھی قائم ہو اور بلاغت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ لہٰذا انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ اس طرح کیا۔

'اللہ کے نام سے شروع'

یہ ہے حضرت امام احمد رضا کی وہ امتیازی خصوصیت جس کے توسط سے ہم قرآن کی مخصوص تعبیرات، موثر اسالیب، الفاظ کے سحر انگیز مواقع استعمال اور ادب وبلاغت کے دیگر پہلوؤں سے لذت آشنا ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور مثال ملاحظہ ہو ''قل'' کا ترجمہ زیادہ مترجمین نے ''کہہ دو اے محمد'' کیا ہے۔ لیکن ان مترجمین کی نگاہ میں یہ نکتہ اوجھل رہا کہ ادب میں اخلاقی قدروں کا بھی اپنا ایک مقام رہا ہے اور پھر یہ کہ جس سے مخاطب ہیں اس کا مقام اور مرتبہ کیا ہے؟ اس باریکی کو امام احمد رضا خان نے سمجھا ان کے نزدیک قرآن کے اسرار واحکام کو واشگاف کرنے کے لیے اس کے الفاظ کی تشریح اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے پیغام کے بیان کو محض لغت اور زبان دانی کے بل بوتے پر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اس کے ساتھ مخاطب کی عظمت واحترام بھی لازمی ہے۔ لہٰذا حضرت امام احمد رضا نے قل کا ترجمہ ''آپ فرما دیجیے'' کیا ہے۔

جب ہم اعلیٰ حضرت کے کنز الایمان اور دوسرے مفسرین کی تفاسیر کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو افتراق ومشابہت کے بہت سارے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً سر سید نے قرآن کی تفسیر اس ڈھنگ سے لکھی، جو مسلمانوں کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عقلی تدبر

اور تفکر کا بہت اثر ہے۔ انہوں نے نزول وحی، فرشتوں کے وجود یا عدم وجود پر جو بحث کی ہے یا جنات کے بارے میں ان کا یہ خیال کہ یہ کوئی علاحدہ مخلوق نہیں وغیرہ ایسا معاملہ ہے، جس پر تنقید ہوتی رہی۔

ایسے بہت سے نکات ہیں جن سے جو ترجمہ نگاری کے سلسلے میں ایک طرف فاضل بریلوی کے تدبر کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف قرآن کی دعوت اور پیغام آشکار ہوتے ہیں۔ اور اپنی اصلاح وتربیت کے سلسلے میں قرآنی ہدایات وتعلیمات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

فقہی بصیرت:

وہ علم، جس سے انسان کے حقوق وفرائض کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور انسانیت حلال وحرام کی تمیز پا کر رُشد وہدایت کے اوج کمال تک پہنچتی ہے، علم فقہ ہے۔ فقہ کا تعلق براہ راست وحی الٰہی سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جس بندہ کو عزت اور آخرت میں مقام ومرتبہ دینا پسند کرتا ہے، اسے دین میں تفقہ اور فہم وبصیرت کی نعمت سے سرفراز کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ جب کسی بندے کے لیے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کا تفقہ عطا کرتا ہے'' لیکن جس طرح وحی الٰہی کا نزول ہر شخص پر نہیں ہوتا اور نہ ہر فرد منصب نبوت سے سرفراز ہوتا ہے بلکہ یہ منتخب اور برگزیدہ بندوں کو ہی ملتا ہے، اسی طرح تفقہ فی الدین کی نعمت بھی اللہ کی طرف سے اس کے پسندیدہ بندوں کو ہی عطا ہوتی ہے اور اس کے لیے منجانب اللہ ایسے ہی رجال کار اور عبقری افراد واشخاص کا انتخاب ہوتا ہے جو ارادتِ الٰہی اور منشائے ربانی کو بتا کر نصوص قرآنی وسنت سے جدید مسائل کے احکام کے استخراج کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ اپنے اخلاق وکردار اور اعمال وافعال میں اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے ہوتے ہیں اور ہمہ دم آخرت کے طالب ہوتے ہیں۔ اس جہت سے ہم اگر اعلیٰ حضرت کا فقہی مقام متعین کریں تو اعلیٰ حضرت کو مجتہد فی المسائل کہنے میں ہمیں کسی قسم کا تردد یا تامل محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس فن پر وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی عمر کے تیرہویں سال میں درس نظامیہ سے متعلق علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اور اپنے والد بزرگوار سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہو کر ۱۴ سال کی عمر میں منصب افتا پر مامور ہوئے اور سب سے پہلا مسئلہ حرمت رضاعت کے متعلق پیش ہوا کہ ناک کے ذریعہ عورت کا دودھ بچے کے حلق میں پہنچ گیا تو حرمت رضاعت ثابت ہوگی کہ نہیں۔ آپ نے مدلل طور پر حرمت رضاعت ثابت ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ اسی طرح جب ایک مسئلہ جمع بین الصلوٰتین دو نمازوں کو ملا کر پڑھ لینے کا مسئلہ آیا، تو غیر مقلد نذیر حسین دہلوی کی کتاب ''معیار الحق'' کے دعووں کو عالمانہ اور مجددانہ انداز میں رد کیا۔ علامہ سید طحطاوی نے زکام سے وضو ٹوٹنے کا جو شرعی جواز متفرع کیا، اس کی رو سے جو

چیز بیماری کے سبب جسم سے خارج ہو، اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ چوں کہ زکام میں بیماری کے سبب پانی ناک سے خارج ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے لیکن امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے اپنے تبحر علمی اور مختلف دلائل وشواہد سے یہ ثابت کردیا کہ زکام سے وضونہیں ٹوٹتا۔ اس لیے کہ زکام کی رطوبات نجس بالخروج نہیں۔ اسی طرح علامہ شامی نے اپنی تصنیف ردالمختار میں امام احمد کے حوالے سے یہ تحریر کیا ہے کہ حضور سے اذان دینا ثابت نہیں ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے مختلف اسناد سے ثابت کردیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں ایک مرتبہ اذان دینا ثابت ہے۔ یہاں تفصیل سے گفتگو کا موقع نہیں۔ اعلیٰ حضرت کی فقہی تدبر اور وسعت نظر کا بین ثبوت فتاویٰ رضویہ ہے، جس کے کمال فقاہت اور اس کی استنادی اہمیت کے متعلق بیسویں صدی کے مولانا ابوالحسن ندوی یوں رقمطراز ہیں:

''فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر مولانا احمد رضا خان بریلوی کو جوعبور حاصل ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے اور اس دعویٰ پر ان کا مجموعہ فتاویٰ شاہد ہے۔ نیز ان کی تصنیف ''کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم'' جوانہوں نے ۱۳۲۳ھ میں مکہ معظمہ میں لکھی (بہ حوالہ نزہۃ الخواطر از ابو الحسن ندوی صفحہ ۴۱)

امام احمد رضا کی بے مثال فقاہت اور تبحر علمی، وسعت مطالعہ کا اندازہ اس مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے، جوحافظ کتب الحرم سید اسماعیل بن خلیل مکی کے رشحات قلم کا ثمرہ ہے اور یہ خط امام احمد رضا کے نام ہے:

''اگر امام اعظم نعمان بن ثابت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ آپ کے فتاویٰ ملاحظہ فرماتے، تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور اس کے مصنف کو (آپ کو) اپنے خاص شاگردوں میں شامل فرماتے''

شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال نے اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہندوستان کے دور آخر میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسا طبّاع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے اور ان کے فتاویٰ ان کی ذہانت جودت طبع کمال فقاہت علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔ مولانا ایک دفعہ جورائے قائم کرلیتے ہیں، اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور وفکر کے بعد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاوی میں کبھی کسی تبدیل یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بایں ہمہ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ گویا اپنے دور کے امام ابو حنیفہ ہوتے'' (فتاویٰ رضویہ جلد پنجم صفحہ ۳)

امام احمد رضا اور تعلیماتِ تصوف:

حقیقی اسلامی تصوف کا مقصد حقائق اسلام پر پختہ ایمان اور گہری بصیرت حاصل کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تصوف رضائے الٰہی کے حصول اور نفس پر قابو پانے اور اخلاق کا تزکیہ کرنے کا نام ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کے اندر یہ شعور پیدا ہو جائے کہ وہ خدا کا بندہ اور سچا عاشق رسول ہے۔ خدا کی بندگی و اطاعت اور رسول کے اتباع میں اپنی زندگی گزارے۔ یوں تو امام احمد رضا کی شخصیت انیسویں اور بیسویں صدی کی عظیم شخصیت ہے۔جنھوں نے اپنی دینی و عملی صلاحیتوں سے عالم اسلام میں ذہنی وفکری انقلاب پیدا کیا، لیکن ان کی شخصیت کی ایک اور اہم جہت ہے وہ ہے تزکیہ، احسان اور تصوف وسلوک کا۔اعلیٰ حضرت اس میدان کے نہ صرف شہسوار ہیں، بلکہ اس کے مبصر اور مجدد بھی ہیں۔ان کے ملفوظات نے لوگوں کے دلوں پر جو اثر ڈالا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔اس میں سنت کی ترغیب بھی ہے اور احکام شرعیہ کی تلقین بھی اور انسانیت کا روحانی علاج بھی۔اعلیٰ حضرت کی زبان مبارک یا قلم سے جو کچھ ارشاد ہوئے وہ عوام وخواص کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ان کے ملفوظات میں اہل سلوک وتصوف کو باطنی خوبیوں سے آراستہ ہونے کے گُر بھی بتائے گئے ہیں۔ساتھ ہی اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ دل کو کس طرح تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن سے مزین کیا جائے۔ان کے ملفوظات کا مطالعہ طمانیت قلب کا ضامن ہے اور ذکر الٰہی و معرفت حق کا امین بھی۔اعلیٰ حضرت کے یہاں شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں۔ ان کے نزدیک وہی تصوف صحیح ہے جو پورے طور پر شریعت کا پابند ہے اور جس میں مقام عبدیت سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں اور جس کا مقصد اللہ کی ذات سے محبت اس کی عبادت، اس کی اطاعت اور اس کی کے لیے کامل انقیاد ہے، وہ اپنی تصنیف ''مقال العرفاء'' میں شریعت وطریقت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''شریعت اصل ہے اور طریقت اس کی فرع۔شریعت منبع ہے اور طریقت اس سے نکلا ہوا دریا۔ طریقت کی جدائی شریعت سے محال ودشوار ہے۔شریعت ہی پر طریقت کا دارومدار ہے......شریعت ہی وہ راہ ہے، جس کا اصول الی اللہ ہے۔اس کے سوا آدمی جو راہ چلے گا، اللہ تعالیٰ کی راہ سے دور جا پڑے گا۔ طریقت میں جو کچھ منکشف ہوتا ہے، شریعت مطہرہ ہی کے اتباع کا صدقہ ہے، حقیقت کو شریعت رد فرمادے وہ حقیقت نہیں بے دینی اور زندقہ ہے۔''

اعلیٰ حضرت کی یہ بے لاگ اور روحانی تحریریں ہمارے اس دعوے کو تقویت بخشتی ہیں کہ ان کے نزدیک تصوف کا خاص مقصد رضائے الٰہی اور تعلق مع اللہ ہے۔ وہ وادی تصوف کے نہ صرف رہرو ہیں

بلکہ راہبر اور مربی بھی۔ فکر کا یہی توازن اعلیٰ حضرت کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہو، تصوف میں عشق رسول کی بنیاد، عرس میں ڈھول اور سارنگی کے ساتھ قوالی کا معاملہ یا عورتوں کے واسطے زیارت قبور کا سوال یا پیرو مرشد کے مزار کا طواف اور سجدہ تعظیمی کا مسئلہ، ہر ایک میں اعلیٰ حضرت نے منہاج شریعت اور منوال سنت کی پاسداری کی۔ لغو کاموں اور لایعنی باتوں سے گریز اور سکوت وخاموشی کی تعلیم دی۔ عرس میں ڈھول وسارنگی کے ساتھ قوالی کو حرام کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی روشنی میں عورتوں کو قبروں کی زیارت کرنے سے منع فرمایا۔ پیرو مرشد کے مزار کے طواف کو بہ نیت تعظیم ناجائز بتایا کہ یہ خانہ کعبہ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ تمام رہنمائیاں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اعلیٰ حضرت کے نزدیک وہی تصوف صحیح ہے جو پورے طور پر شریعت کا پابند ہے۔ اس احتیاط واعتدال سے تصوف کے نکات بیان کیے ہیں کہ کٹر سے کٹر مخالف بھی آپ کے علم وفضل کا معترف ہی نہیں بلکہ معتقد ہو جاتا ہے۔ تصوف کے یہ جواہر پارے نثر میں بھی ہیں اور شاعری میں بھی، یہی صفات وکمالات اعلیٰ حضرت کو تصوف کے رموز ونکات کے میدان میں ایک شہسوار کا رتبہ عطا کرتا ہے۔

احمد رضا کا تعلیمی نظریہ:

مغلیہ سلطنت کے زوال اور برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانی مسلمان سیاسی وسماجی طور پر تنزلی کے شکار ہوئے اور ان پر محرومی ومایوسی کی فضا طاری ہوگئی۔ ساتھ ہی مسلم معاشرے میں ایسی خرابیاں پیدا ہوگئیں جو اس بحرانی دور کی خاصہ تھیں۔ اس سے نجات پانے اور سماج میں عزت ووقعت کا مقام حاصل کرنے کے لیے اس عہد کے مذہبی وسیاسی مفکرین اور سماجی مصلحین نے الگ الگ انداز اختیار کیے اور مختلف تحریکیں شروع کی گئیں۔ تعلیمی نظریات پیش کیے گئے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے جو تعلیم کا نظریہ پیش کیا وہ مسلمانوں کی حالت سدھارنے اور انہیں قعر مذلت سے نکالنے میں نسخہ اکسیر ثابت ہوا جس کی اہمیت وافادیت وجامعیت آج بھی مسلم ہے۔ ان کی ملی غیرت اور دینی حمیت نے مسلمانوں میں مذہبی، سائنسی اور دیگر عصری علوم حاصل کرنے کا ناقابل تسخیر حوصلہ بخشا۔ اس کے مقابلے میں جب ہم سرسید احمد کے تعلیمی تصورات کا تجزیہ کرتے ہیں، تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نظریہ مصلحت پسندانہ تھا۔ وہ اس نظریئے کے موید تھے کہ مسلمانوں کا روایتی نظام تعلیم مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ سرسید کا پختہ عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان اس وقت تک مہذب دنیا میں اپنے لیے جگہ حاصل نہیں کر سکیں گے، جب تک وہ انگریزوں کے ساتھ سمجھوتہ اور یورپی طور وطریقہ نہ اپنائیں اور یہی

ان کی بقاء کا ضامن ہے۔ وہ انگریزی تعلیم پر خاص طور سے زور اس لیے دینا چاہتے تھے کہ مسلمان سرکاری ملازمت کے اہل بن جائیں۔ تہذیب الاخلاق کے ایک شمارے میں اپنے نظریئے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں، وہ بلا شبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے کیوں کہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کے عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں''۔

اس کے برعکس فاضل بریلوی امام احمد رضا خان اس نظریئے کے علمبردار تھے کہ تمام علوم خواہ قدیم ہوں یا جدید، سیاسی ہوں یا تکنیکی ان کا مقصد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کی عظمت وعزت۔۔۔ ہو اور ایک بہتر معاشرے کی تعمیر و تشکیل کا ضامن بنے۔ ساتھ ہی ان علوم سے علم دین بھی حاصل کیا جاسکے۔ اپنی باتوں کی تائید میں فتاویٰ رضویہ جلد دہم کا یہ اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حکیمانہ الفاظ فتاوٰی میں آج بھی گونج رہے ہیں۔

''زباں کھلتے ہی اللہ اللہ پھر کلمہ لا الہ الا اللہ۔ جب تمیز آئے آداب سکھائے۔ کھانے پینے، بولنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، حیاء، لحاظ، بزرگوں کی تعظیم، ماں باپ استاد اور شوہر کی اطاعت کے طریق وآداب بتائے۔ قرآن مجید پڑھائے۔ استاد نیک صالح صحیح العقیدہ، سن رسیدہ کے سپرد کرے اور دختر کو نیک پارسا عورت سے پڑھائے۔ بعد ختم قرآن ہمیشہ تلاوت کی تاکید رکھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و تعظیم ان کے دل میں ڈال دے کہ اصل ایمان و عین ایمان ہے''

اس نثر پارے سے یہ نکتہ منکشف ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت کے نزدیک تمام علوم کی تعلیم اس غرض سے ہونی چاہیے کہ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر سے دین فہمی کا مفہوم واضح ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس نظریئے کو فروغ دیتے رہے کہ تمام علوم کی تعلیم کا مقصد دین فہمی، خدارسی اور رسول شناسی ہو اور غیر شرعی تصورات سے پاک ہو۔ وہ کبھی بھی سائنسی یا عصری علوم کے مخالف نہیں رہے۔ فرماتے ہیں:

'اس طرح بہت سے اجزاء حکمت مثلاً ریاضی، ہندسہ وحساب، جبر ومقابلہ، مساحت ومرایا ومناظرہ، علم مثلث کروی ومثلث مسطح وسیاست مدن وتدبیر منزل، مکائد حروب وفراست وطب وتشریح، نباتات وحیوانات وکائنات، الجبرا وجغرافیہ وغیرہ بھی شریعتِ مطہرہ سے مضرت نہیں رکھتے۔ بلکہ ان میں بعض بلا واسطہ یا بالواسطہ اُمورِ دینیہ میں نافع ومعین اور بعض دیگر دنیا میں بکار آمد ہیں'۔ (فتاویٰ رضویہ جلد دہم)

اعلیٰ حضرت کے نزدیک علوم کی تقسیم علوم قدیم یا جدید میں نہیں کی جاسکتی، بلکہ وہ علوم جو غیر شرعی

تصورات سے پاک ہوں، جائز ہیں۔اس سلسلے میں علوم نافع اور مفیدہ کے لیے ایک معیار مقرر فرمایا، ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: علم نافع وہ ہے، جس کے ساتھ فقاہت ہو۔وہ اس تعلیم کے سخت مخالف تھے، جس پر معاد کے بجائے معاش کا تصور چھایا رہتا ہے اور جو حد سے زیادہ فکر معاش ناروا مصلحت بینی اور مجافیت گزینی کو اُجاگر کرے۔اعلیٰ حضرت شاعر مشرق علامہ اقبال کی اس فکر کے موید تھے کہ تعلیم کو کبھی بھی اسباب طلبی، اعلیٰ منصب کے حصول کا مقصد نہیں سمجھنا چاہیے، ایسی رزق سے موت بہتر ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اعلیٰ حضرت اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

رزق علم میں نہیں رزق تو اللہ کے پاس ہے۔

ماہر رضویات سید وجاہت رسول قادری ماہنامہ معارف رضا شمارہ ۴۴ میں رقمطراز ہیں۔

''امام احمد رضا خان چاہتے تھے کہ قوم کے نوجوان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کی خاطر (اس نیت سے) وہ تمام قدیم وجدید علم حاصل کریں، جس سے اسلام اور عالم انسانیت کا فائدہ ہو، مزید برآں طلبا کے نام یہ پیغام ارسال کرتے ہیں کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ سے اپنے قلوب کو ہمہ وقت منور رکھو، ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اتباع سنت کے نور سے اپنی فکر وعمل کو جلائے رہو اور علم حقیقی کے ہتھیار سے خود کو ہمیشہ مصلح رکھو۔''

اعلیٰ حضرت اور تعلیم نسواں:

۱۸۵۷ کے غدر کے بعد قوم کی مجموعی ابتر حالت میں طبقہ نسواں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ امام احمد رضا کی عقابی نگاہوں نے اس نکتے کو بھانپ لیا تھا کہ اصلاح معاشرہ کی کوئی بھی کوشش تعلیم نسواں کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔جہالت کی تاریکی خواہ مرد میں ہو یا عورت میں ہر ترقی اور تبدیلی کے مانع ہے۔وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کے سلسلے میں بیداری کی جو لہر مردوں میں پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اس کے اثرات طبقہ نسواں تک بھی پہنچیں۔جدید علوم سے ان کو واقفیت ہو۔تو ہم پرستی کے اندھیروں سے نکلیں اور مذہب کی صحیح تصویر ان کے سامنے آئے اور وہ ایسے رسم ورواج کی پابندیوں سے آزاد ہوں، جن سے مذہب کی صورت مسخ ہو رہی ہے۔سرسید خان کا نظریہ اس سلسلے میں مصالحانہ تھا۔وہ اس خیال کے حامی تھے کہ ابھی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔مردوں میں تعلیم آنے سے خود بخود عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سوچیں گے۔ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''اس وقت ہم عام یوروپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں اور عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں، یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے ہیں۔''

اپنے اس نظریئے کی وضاحت پنجاب کے سفر کے دوران ایک جلسے کو خطاب کرتے وقت بھی کیا ہے۔

''اے میری بہنو، تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں، جس میں مردوں کے حالات درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستگی ہو گئی ہو''۔

اوپر کی عبارتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کو ثانوی حیثیت سے دیکھتے تھے جبکہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی احمد رضا کی حکیمانہ بصیرت اور دوراندیشی اس بات کے حق میں تھی کہ عورتوں کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔ ہاں وہ موجودہ بے راہ روی کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک عورتوں کو بنیادی مذہبی تعلیم دی جائے۔ جس کے لیے ماحول نہایت پاکیزہ اور مستور ہونا چاہیے۔ ان کی تعلیم کے لیے اعلیٰ کردار کی حامل استانیوں کی تقرری کی جائے۔ عورتوں سے متعلق مخصوص مسائل کی تعلیم دی جائے۔ پردوں کا خاص التزام ہو، فرماتے ہیں۔

''اور دختر کو نیک پارسا عورت سے پڑھوائے'' (فتاویٰ رضویہ جلد دہم)

اعلیٰ حضرت کے معاشی افکار اور ترقیاتی منصوبے:

اسلامی علوم اور ادب کے آفتاب جہاں تاب مفکر عالم اسلام حضرت امام احمد رضا کی شخصیت کی گوناگوں جہتیں ہیں۔ ان کی نظر آفاقی تھی اور قدرت نے بڑا دردمند دل دیا تھا۔ ایک طرف اعلیٰ حضرت نے علمی ودینی اور تاریخی تحقیقی کارناموں سے عالمی اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کیا، تو دوسری طرف ان کی وسعت نظری، فکر انگیزی اور ترقیاتی منصوبے معاشیات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے خواہاں تھے۔ شخصی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور ملی ترقی پر زور دیتے تھے۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی جو صورتحال تھی اعلیٰ حضرت نے اس زوال وپستی کا خود مشاہدہ کیا۔ انہوں نے مسلم معاشرہ اور اس کے مسائل کا تجزیہ ہی نہیں کیا، بلکہ ایک مصلح، مدبر اور ماہر اقتصادیات کی طرح ان کا حل بھی تلاش کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو فضول خرچی سے پرہیز اور مقدمہ بازی سے دور رہنے کی صلاح دی۔ انہوں نے قرآن کریم کی آیات کی روشنی ''ولاتبذر تبذیرا'' کی روشنی میں مسلمانوں میں یہ صور پھونکا اور یہ احساس دلایا کہ غدر کے بعد مسلمانوں کے مسائل کانٹوں کی طرف قطار باندھے کھڑے ہیں۔ لہٰذا آشوب وابتلا کے اس دور میں پس اندازی لازمی ہے اور یہی بدحالی کو دور کرنے کا واحد علاج ہے۔ مفکر

اسلام کی اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ''بچت'' کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور سرمایہ کاری کی طرف متوجہ ہوئے اور آج جو مسلمانوں کے یہاں غیر سودی بینکنگ کا نظام ہے، یہ اعلیٰ حضرت کے تدبر اور فکر کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے دولت کی صحیح پیداوار اور معیشت کی نمود و استحکام کی ضرورت کی طرف زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو ''خود اعتمادی'' اور ''امداد باہمی'' کا سبق دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی تلقین کی کہ مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسی منڈی کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا، جس کے اراکین خود ضروری اشیا پیدا کریں گے اور خرید و فروخت بھی آپس میں کریں۔ اس پالیسی پر عمل کیا گیا، تو تجارت کو بھی فروغ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے اعلیٰ حضرت کے خیالات، آفاقی نظریہ، ہمہ گیر شخصیت اور معاشی افکار و ترقیاتی منصوبوں پر خاطر خواہ بحث ہونی چاہیے اور اس کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔

اعلیٰ حضرت کی سیاسی بصیرت:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ایک ایسی باکمال ہستی تھے، جو بطن گیتی سے صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ ایک سچے محبِ وطن اور بلند پایہ سیاسی رہنما بھی تھے۔ وہ عزم، استقلال اور ہمت کا پیکر تھے۔ حوادث کے سخت سے سخت طوفان اور آندھیوں نے بھی ان کے پائے استقلال کو نہیں ڈگمگایا۔ اعلیٰ حضرت کے وقار و تمکنت، فراست دینی و دنیوی علوم میں تبحر اور دانشوری قیادت میں سبقت کی وجہ سے ان کا نام ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مہر منور کی طرح چمکتا رہے گا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے سیاسی نظریئے کے دو پہلو تھے۔ ملک کی آزادی اور ملت کی قیادت، سیاسی اعتبار سے وہ کبھی بھی غیر ملکی اقتدار سے تعاون کے حق میں نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمائے دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے۔ آپ نے اسلامی روایات کی روشنی میں ان تمام تحریکات کے خلاف شرعی فتویٰ صادر کیے اور مسلمانوں میں یہ صور پھونکنے کی سعی مستحسن کی کہ مسلمان ملت و ملک دشمن عناصر کے خلاف آواز اٹھائیں اور ان سازشوں کو بے نقاب کریں، جو مذہب اور اصلاح قوم و ملت کے نام پر برطانوی حکومت کا پس پردہ مدد کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے ایسے عناصر کے ناپاک ارادے کی بیخ کنی اپنی ایک نظم ''صمصام حسن'' میں ادبی انداز میں پیش کی ہے۔ وہ آج بھی دعوت فکر دیتی ہے۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ برطانوی سلطنت کے ہند میں استحکام کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے مذہب کے تحفظ اور تہذیب کی بقا کا تھا مغربی علوم کا بحر بیکراں اُمڈتا چلا آرہا تھا اور سیاسی زوال کے ساتھ قدیم اسلامی علوم کے پاؤں بھی اکھڑتے جارہے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے اس خطرے کو

محسوس کیا اور اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی تعلیم جس سے مسلمان مسلمان نہ رہے اور اپنے دین کی طرف سے بالکل اندھا بہرا بن جائے، یہ تعلیم مسلمانوں کے لیے فائدہ مند کسی بھی حالت میں نہیں ہوسکتی۔ وہ اس نظریئے کے علمبردار تھے کہ مسلمان اپنے مذہب و دین کو استحکام بخشتے ہوئے سیاست کو اپنی جولانگاہ بنائیں، اپنی دینی حمیت وشناخت برقرار رکھتے ہوئے حکومت کے کسی اعلیٰ عہدہ پر سرفراز ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ ہمیشہ اس فکر پر تاسف کا اظہار کرتے رہے۔

''وہ لوگ جن سے پوچھا جاتا کہ صاحبزادوں کو قرآن نہ پڑھایا، تو جواب دیتے ہیں کیا ان سے رسوم کے چنے پڑھانا ہے۔''

اعلیٰ حضرت نے نامساعد حالات کے باوجود نہ تو اپنے اصولوں کی قربانی دی اور نہ باطل قوتوں سے مرعوب ہوئے۔ ۱۸۵۷ کے غدر کے بعد جب میدان سیاست وقیادت کے بڑے بڑے سورما مخالف ہواؤں کا رخ دیکھ کر اپنے راستے سے منحرف ہونے لگے، تو امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ اٹل رہے اور اپنے سخت موقف اور استقلال کی مثال قائم کردی۔ اسلامی زاویہ نگاہ سے ملت کی رہنمائی کی اور اجتماعی و دینی وملی مفاد کو مدنظر رکھا۔ قدرت نے انہیں ایسی جوہری توانائیوں سے نوازا تھا، ایسے پر آشوب حالات میں ملت کی رہنمائی ایک سچے محبّ وطن اور ہمدرد کی حیثیت سے شرعی اصول وضوابط کی روشنی میں کیا۔ مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی اور **واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا** کی تلقین کرتے رہے۔

امام احمد رضا اور سائنسی علوم:

امام احمد رضا ایک ذی ہوش اور روشن خیال تھے۔ انہوں نے تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیا۔ سیاسی نشیب و فراز کو بخوبی سمجھا اور مسلمانوں کی روز افزوں پستی کا تجزیہ کیا۔ دوسری طرف وہ سائنسی علوم، منطق، ہندسہ، فلسفہ کے شیدائی ہندسہ کے دلدادہ تھے۔ علوم مشرقیہ سے انہیں بڑا شغف تھا۔ سائنسی علوم کی اہمیت کا انہیں خوب اندازہ تھا، انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا میں نئے علوم اور نئی معلومات جو سامنے آرہی ہیں، ان کی طرف مسلمانوں کو توجہ دینی چاہیے۔ خود ہی اپنی تصنیفات میں سائنس کے ایسے ایسے نکات بتائے ہیں کہ دوسرے سائنس کے ماہرین و محققین ان کو پڑھ کر انگشت بدنداں ہوجاتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نہ صرف ایک دینی وملی عبقری شخصیت ہیں، بلکہ سائنسی علوم پر بھی انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مثلاً فتاویٰ رضویہ جلد اول میں ایک مقام پر پانی کی رنگت پر بحث کرتے ہوئے آبی بخارات water vapors کے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ یہ اجزا کیوں کر بادلوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور طرف کے اجزا اگرچہ پانی کے اجزا سے باریک ہیں، مگر کیوں کر برف اوپر سے نیچے گرتی ہے۔

اسی طرح فتاویٰ رضویہ جلد سوم میں نظریۂ روشنی کے سلسلے میں جو بحث ہے، وہ ان کی فکر انگیز تحقیق کا بین ثبوت ہے۔

سمت قبلہ دریافت کرنے کا جو عملی طریقہ امام احمد رضا نے اپنی تصنیف ''کشف العلہ'' میں پیش کیا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ پچھلے صفحات میں اعلیٰ حضرت کے علم مثلث کے سلسلے میں گفتگو ہو چکی ہے اسی طرح سراب (mirage) کے سلسلے میں جو totel intional reflection کے حوالے سے جو بحث کی ہے، وہ ان کے سائنسی علوم پر مہارت اور استثنا پر دال ہے۔ کہتے ہیں۔

زمین شور میں دھوپ کی شدت میں دور سے سراب نظر آنے کا بھی یہی باعث ہے، خوب چمکتا، جنبش کرتا پانی دکھائی دیتا ہے کہ اس زمیں میں اجزائے صقلیہ شفافہ دور تک پھیلے رہتے ہیں۔ نگاہ کی شعاعیں ان پر پڑ کر واپس ہوئیں اور شعاع کا قاعدہ ہے کہ واپسی پر لرزتی ہے جیسے آئینہ پہ آفتاب چمکے۔''

low of reflection of light کے سلسلے میں امام احمد رضا کا نظریہ کا معاملہ ہو یا علم صحتیات کا، ہر ایک پر ان کی گرفت ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سعید احسن قادری

صدر شعبۂ علم الادویہ، یونانی میڈیکل کالج، پونہ

ممبر آف بورڈ آف اسٹڈیز یو. جی، فیکلٹی آف

آوریدا اینڈ یونانی، ہیلتھ یونیورسٹی ناسک

امام احمد رضا اور طب یونانی

امام احمد رضا قدس سرہ کبھی بھی منصب طبابت پر جلوہ افروز نہیں ہوئے اور نہ ہی کوئی طبی تصنیف آپ کی تصانف میں شامل ہیں مگر ضرورت آ گئی تو طب کے اہم موضوعات پر اپنی حذاقت اور تبحر کو اس طرح پیش کیا کہ عالمینِ طب بھی ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں۔

حالانکہ امام وقت نے کبھی بھی کسی طبی درسگاہ کا رخ نہیں کیا اور نہ ہی کسی طبیب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر امام کو اس فن میں دسترس کس طرح حاصل ہوئی ؟ اس کا

جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ قرآن عظیم جو علوم و معارف کا گنجینہ اور سر چشمہ ہے جس میں تمام علوم وفنون پوشیدہ ہیں تو جس طرح امام نے نعت گوئی قرآن کریم سے سیکھی اسی طرح یہ رموز و قرائن بھی اسی کتاب عظیم سے حاصل کیا۔

اپنے مقالے کی ابتدا اس بنیادی اصول سے کرنا چاہوں گا جا امور طبعیہ کی حیثیت سے طب یونانی کا ایک حصہ ہے جس کے اصول وضوابط کا ذکر امام احمد رضا کے ایک مکتوب میں ملتا ہے امام وقت تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) اختلاف فصل، اختلاف بلند، اختلاف عمر، اختلاف مزاج سے علاج مختلف ہوتا ہے ایک نسخہ ایک مریض کے لیے ایک فصل میں صدہا بار مفید ہو چکا کچھ ضرور نہیں کہ دوسری فصل میں بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ ضرر پہنچائے وعلیٰ ھذا اختلاف البلاد والاعمار والامزجہ وغیرھا۔

(۲) مرض کبھی مرکب ہوتا ہے ممکن کہ ایک نسخہ ایک مرض کے لیے تم نے فصول مختلفہ، بلاد متعددہ، اعما متفاوتہ اور امزجہ متبائنہ میں تجربہ کیا اور ہمیشہ ٹھیک اترا اگر وہ مرض ساذج تھا یا کسی ایسے مریض کے ساتھ تھا جسے یہ مضر نہ تھا۔ اب جس شخص کو دے رہے ہو ایسے مرض سے مرکب ہو جس کے خلاف تو ضرر دے گا اور وہ تجربہ صد سالہ لغو ہو جائے گا۔ (کلیات مکاتب رضا)

ان ہدایات کو دیکھا جائے تو مزاج، ارکان، اعضاء، افعال، قویٰ جو امور طبعیہ کے مبادیات ہیں اسکے علاوہ احوال بدن، امراض واسباب اور اس میں اسباب ستہ ضروریہ کا دخل یہ وہی طبیب کہہ سکتا ہے جو صاحب بصیرت ہو اور امورِ طبعیہ پر غائرانہ نظر رکھتا ہو تو کہنا پڑے گا کہ امام نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا۔

یہ وہ اصول ہیں جس پر عمل کرنا طبیب کے لیے ضروری ہے اس لیے تبدیلی آب وہوا سے جسمِ انسانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح فصول مختلفہ میں مختلف بیماریوں کا وجود مخصوص عمر میں مخصوص امراض بلاد سرد اور بلاد حار کی تمیز خصوصی طور پر خط استویٰ سے قرب وبعد بلاد وامصار کا ہونا اور مختلف المزاج کی مختلف بیماریاں جب تک طبیب کے ذہن میں تشخص فارقہ کے ساتھ موجود نہ ہوں علاج ممکن نہیں۔

بیماریوں کی تعداد ان کی کیفیت وکمیت کا جاننا بھی لازمی ورنہ علاج ضرر سے خالی نہیں اسی مکتوب میں نبض کی پہچان اور اس کی جو تشخیص مرض کا بہترین اور مستدن ذریعہ ہے امام کے علم

النبض پر دسترس کی غمازی کرتا ہے۔

طبیب کے عادات واطوار کا تعین، وصیت بقراط، سے کہیں زیادہ وزنی ہیں جس کا ذکر امام کے اسی مکتوب میں ملتا ہے۔ نیز طبی اصول پر ہی نہیں بلکہ شرعی قباحتوں کو بھی مربوط کردیا اور دلیل میں ابوداؤد شریف کی حدیث ''من تطیب ولم یعلم منه طب فهو ضامن'' اسے امام کی انفرادیت سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے آبِ مطلق اور آب مقید کی تفصیل اگرچہ سائل کا مقتضیٰ فقہی سوال تھا مگر امام وقت نے تقسیم آب پر خامہ فرسائی کی تو ۳۵۰ تین سو پچاس پانیوں کا ذکر کردیا جب کہ عام کتب طب میں پانی کی ۱۳ر قسمیں بیان کی گئی ہیں البتہ باباء طب 'بقراط' نے ایک مستقل کتاب 'کتاب الاہویہ والمیاہ' کے نام سے تحریر کیا ہے جسمیں پانی کی قسمیں علاقہ کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۲ر اور قابل استعمال ۲۷ر کی تفصیل ملتی ہے۔

امام وقت کی فکری اور تخیلاتی بلندی دیکھئے آپ کو قوت ادراک کا موجیں مارتا ہوا سمندر نظر آئے گا۔

میرا موضوع آب نہیں اس لیے اس کی تفصیل سے درگزر کرتے ہوئے اس فہرست میں شامل دواؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا جن کا تعلق علم الادویہ (مفردات) سے ہے وہ بھی چند دواؤں کی ماہیت جس سے احمد رضا کے اس عظیم علمی خزانہ پر روشنی ڈال سکوں جو شعبۂ طب کا ایک اہم شعبہ ہے جہاں نوع بنوع پانی کا تذکرہ ہے وہیں پر دواؤں کے پانی پر تفریع کرتے وقت امام کے قلم سے ایک بحر ذخار نمودار ہوگیا اور ادویہ کی ماہیت پر قلم کے وہ موتی بکھیرے کہ دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ 'ابن بیطار' کو بھی امام نے پیچھے چھوڑ دیا جو نباتی، معدنی، حیوانی دواؤں کی شناخت اور اس کی ماہیت کا امام سمجھا جاتا ہے۔

تائید میں پہلے تو ادویہ کی فہرست، پھر مفرد دواؤں کی ماہیت پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ جسے امام نے متعین کرکے طبی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جہاں تقسیمِ آب خود ایک بین شہادت ہے وہیں کس دوا کی کیفیت اور کمیت کیا ہے اور وہ کس شکل میں وجود پذیر ہوتی ہے؟ امام کی اس فنی مہارت کو اجاگر کرتی ہے جسے ماہیت دواء کہا جاتا ہے۔

فہرست ادویہ:

شنجرب، کسم، چونا، ریشم، چاول، چنا، باقلا، صابن، اشنان، ریحان آب بابونہ، آب خطمی،

بیری، عرق گاؤ زباں، عرق کیوڑہ، عرق گلاب، عرق بید، مشک، خرما، کیسر، کسیس، مازو، زعفران، سرکہ، انگور، دودھ، لوہا، چاندی، سونا دواء مغسول، عرق بادیان، عرق مکوء، آب کاسنی، خربزہ، تربوزہ، خیارزہ، سیب، کد، شراب ریباس، انار شیریں وترش، آب مقطر، آبکامہ، نمک، نوشادر، کافور، نفط بالکسر، روغن زیتون، روغن صنوبر نر، راتیانج، قطران، قفر لاہود، عنبر، مومیائی، سلاجیت، نیم، ماء اللحم، آب یخنی، برگکنار، کشمش، خیساندہ، عرق بہ قرع انبیق، شلجم، زنجبیل، بھنگ، افیون گاجر، پاشویہ، نطول، حقہ کا پانی، ماءُ العسل، ماء الشعیر، ماء النون (اس مچھلی سے نکلتا ہے جس پر نمک چھڑکا گیا ہو) ماء الجمہ (ایک قسم کی مچھلی ہے جو دریاء چین اور ہند میں ملتی ہے جو کہ سیاہ آب غلیظ کی شکل میں ہوتا ہے) نحاس، رصاص، زلال، زفت اور آب غط وغیرہ۔

اس میں کچھ چیزوں کو مخصوص طریقۂ عمل سے بنایا جاتا ہے جو علم الصید لہ یعنی دواء سازی کا حصہ ہیں نیز معالجاتی اصطلاحات طریقۂ علاج کی نشاندہی کرتی ہیں۔ وہیں پر اشکال ادویہ کا ذکر جومرکبات پر دسترس کی روشن دلیل ہے۔

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

چند دواؤں کی ماہیت آپ کے سامنے ہے پھر فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ امام احمد رضا علوم کی کس منزل پر فائز نظر آتے ہیں۔

۱ قطرنا: جسے ہندیمیں گرجن کہا جاتا ہے۔

ماہیت:

☆ شربین نامی درخت کا آنسو ہے

☆ درکست ٹپکتا ہے اور جم جاتا ہے۔

۲ قفر الیہود

ماہیت: ایک رطوبت ہے جو پہاڑوں سے نکل کر منجمد ہو جاتی ہے۔ پانی کی سطح پر تیرتی رہتی ہے جو مرطوب اور سیالہ ہوتی ہے۔ سمندر کی گہرائی میں پتھریلے چشمے سے نکلتی ہے اور طغیانی آنے پر یہ پتھروں پر جم جاتی ہے پھر اسے علاحدہ کرلیا جاتا ہے۔

۳ نفط

ماہیت: بعض زمینوں سے جوش کھا کر رطوبت کیس خارج ہوتی ہے۔ سیاہ اور سفید دو قسموں کی ہوتی ہے اس کا مولد عراق ہے۔

۴ آب مومیائی

ماہیت: پہاڑوں کے دروازوں سے گوند کے مثل ایک رطوبت ٹپکتی ہے جو کہ ابتداء پانی کی شکل کی ہوتی ہے اور بعد میں ایک چکنا پردہ لیے ہوئے منجمد ہو جاتی ہے کچھ ریت اور کچھ پتھر لیے ہوئے جسے دیگ میں ڈال کر جوش دیا جاتا ہے اور جب چکناہٹ، مائیت، ریت اور پتھر علاحدہ ہو جاتے ہیں اس وقت دیگ کو بند کر کے حرارت سے علاحدہ کر لیتے ہیں اور ٹھنڈا ہو جانے پر دیگ کا منہ کھول کر پانی کی سطح پر موجود جرم کو حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ کئی بار عمل میں لایا جاتا ہے۔

۵ عنبر

ماہیت: ایک رطوبت ہے جو جزیرے یا کان جو سمندر میں واقع ہوتے ہیں نکلتی ہے اور مدو جزر وتلاطم نیز آفتاب کی حرارت سے سطح آب پر پردہ پردہ بستہ ہو جاتی ہے۔

☆ ایک سمندانور کی لید۔

مذکورہ دواؤں کی ماہیت پر نظر کریں اور امام احمد رضا کی دقت نظری کی داد دیتے رہیں انکی شکلوں کا تعین وہی شخص کر سکتا ہے جو دواشناسی میں یکتائے روزگار ہو۔

ہم امام کی ذہانت، تبحر علمی، وسعت نظر، دقت نظر، گہرائی و گیرائی اور فن میں یکتاء روزگار پر داد و تحسین بھی تو دینے کے لائق نہیں اس لیے کہ جماعت اہل سنت کے وہ شیوخ جن کے ہاتھوں میں لوح وقلم کی بادشاہت تھی یا وہ خطبا جنھوں نے امام کے نام کو ذریعہ معاش بنا کر ہر خطے کو آباد کیا، حاملین نقد ونظر جن کا محور صرف تنقید! صحیح طور پر ۹۱ رسال میں تعارف نہ کرا سکے۔

خزاں کا موسم ہمیشہ نہیں رہتا، باد بہاری پیغام رضا، نظریات رضا، افکار رضا، اور تحقیقات رضا کو عالم اسلا میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

علم قبالت اور امراض نسواں سے بھی امام احمد رضا کی ڈائری خالی نہیں ہے۔ ایک طبیب کامل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں بھی فاضل بریلوی منفرد نظر آتے ہیں۔ علامات حمل اور حمل ذکور واناث کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

۱ داہنے یا بائیں پستان کا حجم کا بڑھنا۔
۲ یا سر ہائے پستان میں سرخی یا ادواہٹ کا پایا جانا۔ (دورانِ حمل رطوبت خارج ہوتی ہے)
۳ روئے زن پر شادابی یا تیرگی کا چھانا۔
۴ حرکت زنمیں ثقل وخفت کا پایا جانا۔
۵ قارورہ میں اکثر اوقات حمرت یا بیاض کا غالب رہنا۔
۶ یا عورت کا ان اشیاء کو کرنا جس کی عادت نہ ہو۔

مزید حمل کے تیقن اور رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی کے لیے نسخہ تجویز کرنا جو خالص اطباء کی زبان میں ہو جہاں یہ نسخہ طبیب حاذق، ماہر معالجات کی نشاندہی کرتا ہے وہیں علم الادویہ کی اس شاخ پر بصیرت اور نگاہ نقد ونظر کی بھر پور تائید کرتا ہے جو ادویہ مفرودہ پر مشتمل ہے جس میں دوا شناسی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

نسخہ: پشم کبود (سفید ریشم) میں زراوند مدقوق بعسل سرشتہ کا صبح علی الریق الحمول اور ظہر تک مثل صائم رہنا آیا منہ کا مزہ تلخ ہے یا شیریں؟

یہ وہ تجربات ہیں جو سونو گرافی کو منہ چڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نسخہ نویسیِ فنی مہارت، بالغ النظری، غائرانہ فکر اور لطفی البیانی کی برہان ہوتی ہے جو امام وقت کی تحریر میں جابجا اہل علم کو متوجہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

امام وقت نے برص کا ایک نسخہ تجویز فرمایا جس میں سم الفار، صندل سفید ایک اور دس کے تناسب سے سحق بلیغ کر کے خارجی طور پر استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔

جب یہ نسخہ سامنے آیا تو ذہن میں ایک سوال یہ آیا کہ خارجی طور پر سنکھیا کا استعمال کیوں کر مفید ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مفردات کی مستند کتابوں کا میا تو معلوم ہوا کہ سنکھیا جہاں تصفیہ دم کا کام کرتی ہے وہیں اسکا ایک فعل جاذب بلغم بھی ہے۔

دوررس اور دقتِ نظر تو دیکھیے کہ جب بلغم کا انجذاب ہو جائے گا اس وقت خلیات لونیہ اپنا فعل انجام دینے لگیں گے اور چوں کہ اس کے استعمال سے مقامد ماؤف پر دانے نکلیں گے جس سے رطوبت خارج ہونے میں آسانی ہوگی۔

جاذب رطوبت جو خالص اصطلاحی لفظ ہے اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ مدعا

تک بآسانی پہنچا جاسکے۔

جاذب

☆ وہ دواء جو اپنی حرارت ولطافت کی وجہ سے خلط یا رطوبت کو ایسی جگہ کھینچ لائے جہاں سے مادہ بآسانی خارج ہو جائے۔

☆ یا اخلاط ورطوبت کو جنبش میں لائے

اس تعریف سے امام وقت کے اس علم کا پتہ چلتا ہے جسے اصولِ علاج کہا جاتا ہے۔

ان تفصیلات سے میں یہ کہنے میں حق بجانت ہوں کہ امام وقت کا علم، کلیات ادویہ، امورِ طبعیہ، علم الادویہ (جس میں ماہیت اورافعال شامل ہیں) ماہیت الامراض، اصول تشخیص، اصول، علاج، علم الصید لہ اور منافع الاعضاء جیسے علوم پر محیط ہے۔

علم الجنین جیسے اہم موضوع پر بھی امام احمد رضا نے خامہ فرسائی کی ہے، انتہائی حیرت واستعجاب ہے کہ علم الجنین پر کسی بھی طبیب کی تحریر نظر نہیں آتی تو وہ کون سا طریقہ تھا جسے امام احمد رضا نے اپنایا اور علم الجنین پر اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا تو یہی کہنا مناسب ہوگا کہ یہ علم ''علم عطائی ہے'' اس لیے کہ جو شخص علوم قرآنیہ اور علم الحدیث کا امام ہو سکے لیے بعید نہیں اس لیے کہ وہ علم کی اس قسم سے متصف ہوتا ہے جسے علم مکاشفہ کہا جاتا ہے۔

من فہم الرموز ملک الکنوز

جدید تحقیق کی روشنی میں Uterus یعنی رحم کی تشریح یہ ہے رحم میں تین غشائیں ہوتی ہیں۔

(1) Endo metrum (Inner)

(2) Myo metrium (meddle)

(3) perimetrium (outer)

ان میں Myometrium کیتین لیرس ہوتی ہے جو صرف دوران حمل ہی ظاہری ہوتی ہیں۔

جس کی

Outerlyer	Longi tudinal	ہوتی ہے	اور اسی کی تحریک جنین کو باہر نکالتی ہے۔

Intermediat	Cris Cross	ہوتی ہے	
Inner layer	Cerculur	ہوتی ہے	

اور جب نطفہ مضغہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس وقت اسے Trileminur Germ Disk کہا جاتا ہے جس میں تین Celles ہوتے ہیں۔

(1) Ectoderm (2) Mesoderm (3) Endoderm

یہی Celles مختلف اعضا کی تشکیل کرتے ہیں۔

اب بچہ کے اوپر دو غشائیں رہتی ہیں:

ا۔ Amnion جس میں Aminiotic fleud رہتا ہے جس سے بچہ ہر عوارض سے محفوظ رہتا ہے۔

۲۔ Chorion جو کہ Plasanta یعنی مشیمہ بناتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ امام احمد رضا نے کنز الایمان میں جن تین اندھیریوں کا ذکر کیا ہے اس سے مراد Myometrium کی تین غشائیں ہیں جو صرف دوران حمل ہی ظاہر ہوتی ہے اور مدعا بھی یہی ہے کہ ''تمہاری ماؤں کے پیٹ میں بناتا ہے ایک طرح کے بعد ایک طرح تین اندھیریوں میں۔

جب تک نطفہ قرار نہیں پاجاتا Myometrium جو Uterus کی ایک غشاء ہے موجود رہتی ہے مگر Intermediat,outer اور Inner layer کا ظہور نہیں ہو پاتا۔

یہی تشریح اعلیٰ حضرت کے مقتضیٰ کو ثابت کرتی ہے اس طرح اس قرآنی آیت سے مدارج جنین اور تین غشاؤں کا استخراج حمد رضا کا ہی حصہ ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا رقمطراز ہیں: ''اور اس جاءِ تنگ وتار میں جنین محبوس ہو جاتا ہے وہ بھی یوں نہیں بلکہ اس پر تین غلاف چڑھے ہوتے ہیں، ایک غشاء رقیق ملاقی جسم جنین جس میں اس کا فضلہ (Wax) جس کو Lanugao کہتے ہیں سے بچے کی جلد محفوظ رہتی ہے۔ اس پر ایک اور جب اس سے کثیف تر مسمیٰ بہ غشاء لفافی جس میں فضلہ بول یعنی Amionitic Flaud جمع رہتا ہے اس پر ایک اور غلاف اکثف کہ سب کو محیط ہے جو Indometril basalis کہلاتا ہے۔

مقالہ کا اختتام امام احمد رضا کے اس فرمان سے کرنا چاہوں گا جو علماء اہل سنت اور قائدین ملت کے لائحہ عمل کا درجہ رکھتا ہے۔ امام فرماتے ہیں:

(۱) خالص اہل سنت کی ایک قوت اجتماعی کی ضرورت ہے مگر اس کیلیے تین چیزوں کی سخت حاجت ہے۔

الف: علماء کا اتفاق

ب: تحمل شاق، قدر بالطاق

ج: امراء کا انفاق لوجہ الخلاق

(۲) اہل سنت سے بتقدیر الہٰی جو ایسی لغزش فاحش واقع ہو اس کا اخفا واجب ہے کہ معاذ اللہ لوگ ان سے بداعتقاد ہوں گے جو نفع ان کی تقریر اور تحریر سے اسلام وسنت کو پہنچتا تھا اس میں خلل واقع ہوگا۔ اس کی اشاعت اشاعت فاحشہ ہے اور اشاعت فاحشہ بنص قطعی قرآن عظیم حرام ''جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں فاحشہ کی اشاعت ہو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔'' (القرآن)

اہل سنت اس تہدیدی آیت کو ملاحظہ فرمائیں اور امام کے اس قول پر اگر عمل پیرا ہو جائیں تو سوادِ اعظم کی عظمت رفتہ بحال ہو کر رہے گی اور امام کی بارگاہ میں بہترین خراج عقیدت بھی۔

استفادہ

۱	کنز الایمان	
۲	امام احمد رضا اور میڈکل سائنس	:ڈاکٹر محمد ملک (مجلّہ اسلام اور سائنس)
۳	فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲ / ص: ۱۹۵، ۱۹۴	امام احمد رضا
۴	کلیات مکاتیب رضا دوم	:ڈاکٹر غلام جابر شمس
۵	الصمصام	امام احمد رضا
۶	معارف رضا سالنامہ ۲۰۰۳ء کراچی	
۷	ریسرچ آف امام احمد رضا	:ڈاکٹر محمد ملک
۸	مخزن الادویہ (مترجم)	:حکیم مولوی نور کریم
۹	کلیات قانون (مترجم)	:شیخ الرئیس
۱۰	بستان المفردات	
۱۱	کتاب الادویہ والاغذیہ	:ابن بیطار
۱۲	کتاب الاہویہ والمیاہ	:بقراط
۱۳	Datta	
۱۴	Down	
۱۵	پیغام رضا	
۱۶	منہاج اللہ والکیمیا	:حکیم رفیق الدین
۱۷	اصول طب	:حکیم ہمدانی
۱۸	کلیات ادویہ	:حکیم ایوب علی
۱۹	کتاب الادویہ	:حکیم کبیر الدین

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام
ایسوسیٹ پروفیسر شعبۂ اردو
جواہر لال یونیورسٹی، نئی دہلی

نئی نسل اور فکرِ رضا کی ترسیل

مسائل اور امکانات

اکیسویں کی دوسری دہائی اپنے تمام تر انتشار اور تخریب کاریوں کے ساتھ ہمارے دروازوں پہ دستک دے رہی ہے۔ اس صدی نے اپنی شناخت ''بازار'' کے زور پر قائم کرلی ہے۔ یہ صدی صارفیت اور عالم کاری کی صدی ٹھہر چکی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عہد حاضر میں کامیابی وکامرانی کا سہرا اسی کے سر سجے گا جو عالم کاری globalization کے تقاضوں اور صارفیت consumerism کی شاطرانہ چالوں سے واقف ہوگا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو تقریباً تمام اہلِ ہوش وخرد نے نہ صرف قبول کرلیا ہے، بلکہ اس پہ عملی اقدامات بھی کررہے ہیں۔ ایسے دور میں جب بازار ہی متاعِ جہان ٹھہری ہے، وہاں ایمان وعقیدہ کی باتیں کرنا اور اس کے تحفظ کی کوششیں کرنا شاید نئی نسل کے لیے حیرت انگیز ہو۔ کیوں کہ ہم نے نئی نسل کو مادی تعلیم وتربیت کے تمام مواقع تو فراہم کردیے ہیں، لیکن اجتماعی اور معاشرتی سطح پر اس کے اطلاق implical emcntom کی باتیں نہیں کرتے کیوں کہ جدید تعلیم، جس کا محور ومنبع صرف اور صرف بازار ہے، وہ اس کی نفی کرتی ہے۔ یہاں سب سے سنگین مسئلہ یہ ہے کہ خود نئی نسل کے سامنے بہتیرے مسائل ہیں، جوان کی زندگی کے حسین لمحات کو عذاب بنا رہے ہیں، زندگی کی دوڑ میں وہ پیچھے نہ رہ جائیں، اس لیے ہم نت نئے طریقے اپنا کر انہیں مزید بازار کی تعلیم کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ ایسے میں جب بنیادی مذہبی تعلیم کا حاصل کرنا ہی ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن جائے، تو مسلک اور عقیدے کی باتیں کرنا اور سمجھانا شاید سب سے مشکل کام بن جاتا ہے۔ پھر 'فکر رضا' کی ترسیل کیسے ہو؟ یہ اور بھی مشکل امر بن گیا ہے۔ اس طرح اب یہ سوال نئی نسل سے ہٹ کر ہماری جانب آجاتا

ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ ایک سوال ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ کئی سوالات منہ پھاڑے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں مذہب کی تعلیم اور شعور کیسے دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ انہیں عقیدے اور مسلک کی باتیں کیسے سمجھائیں؟ اس حوالے سے یہ اہم سوالات ہیں، جن کا جواب اگر مل جائے، تو شاید ہم اس سیمینار کے ذریعے ایک بڑے ہدف کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان سوالوں کے ساتھ جو دیگر سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں، وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ کیا نئی نسل کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ مذہبی تعلیم حاصل کر سکیں؟ اور ان تک فکر رضا کی ترسیل ممکن ہو پائے؟

۲۔ کیا ہمارے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں (جدید تعلیم کے لیے medium) کہ ہم آسانی سے اپنے اسلاف کی باتیں انہیں بتا سکیں؟

۳۔ کیا ہمارے پاس ایسی کتابیں موجود ہیں، جو بچوں کی عمر اور ان کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر تیار کی گئی ہیں؟

۴۔ کیا ہمارے معاشرے میں ایسی تقریب باہتمام ہوتی ہے، جو نئی نسل کے لیے سیکھنے سکھانے میں معاون ہو؟

۵۔ کیا مسجد کی تقریروں میں یا جلسوں (سب جلسے ایک جیسے ہوتے ہیں) میں ایسی سنجیدہ اور سبق آموز باتیں کی جاتی ہیں کہ وہاں سے بچے کچھ سیکھ سکیں؟

یہ وہ بڑے سوال ہیں جن کا جواب اگر ڈھونڈ لیں، تو شاید اس چیلنج کا ہم مقابلہ کر سکتے ہیں اور اسلام کی میراث کی نہ صرف حفاظت کر پائیں گے، بلکہ انہیں اپنی نسلوں تک منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہو پائیں گے۔

ان سوالات کو ہم نے یہاں اس لیے رکھا ہے کہ یہ سیمنار ہے، جلسے میں تو شاید ایسی سنجیدہ باتیں نہ کر سکیں مگر آپ نے یہ اچھی کوشش کی ہے، تو میں نے سوچا موقع سے فائدہ اٹھایا جائے، تو شاید کچھ کام کی بات نکل آئے۔

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ یقیناً آج کے بچوں کے پاس دیکھیں، تو وقت کی بڑی کمی ہے۔ لیکن اگر ہم منصوبہ بند طریقے سے Time management کر لیں، تو یہ ممکن ہے! چھٹیوں میں، خاص کر گرمی اور سردی کی طویل چھٹیوں میں اگر ہمارے ادارے بچوں کے لیے کوئی Attractive پروگرام بنا پائیں تو یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ جی ہاں! ہم تو محض اشارہ کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے دانشور اور علماء متحد ہو کر بیٹھ جائیں، تو ممکن ہے۔

دوسرا اور تیسرا سوال ہمارے لیے لمحۂ فکریہ اس لیے ہے کہ اس سمت میں کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ الحمدللہ ہمارے درمیان ایک سے ایک تخلیق کار اور صاحب قلم موجود ہیں، مگر بچوں کو ذہن میں رکھ کر بہت کم نعتیں اور نظمیں لکھی گئیں اور اسی طرح کتابیں بھی شاید و باید موجود ہیں۔ اگر مجھے معاف کریں اور اجازت دیں، تو یہ کہنے کی جسارت کروں کہ سنی دنیا میں سب سے زیادہ کتابیں اعلیٰ حضرت پر لکھی گئی ہیں، الحمدللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے، کیوں کہ ابھی بھی کئی گوشے ایسے ہیں جن پر کام ہونا باقی ہے۔ لیکن اب تک جو مقالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا جائزہ لیا جائے، تو تعریف وتوصیف کے دائرے سے بہت کم ہی مصنف آگے نکل سکتے ہیں۔ تحقیقی اور تجزیاتی طریقۂ کار کو ہم درکنار کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں کے قارئین کو خود کم کر لیتے ہیں اور ان کتابوں کو پڑھنے والا وہی ہوتا ہے جو اعلیٰ حضرت کو مانتا ہے اور ان کے نام کا نعرہ لگاتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت پر جو ویب سائٹ موجود ہیں، ان میں سے بیشتر کا حال بھی یہی ہے۔ زیادہ تر ویب سائٹ اس قدر مذہبی رنگ وروغن میں ڈوبا ہوا ہے کہ عام لوگ ہوم پیج سے آگے بڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا کہ یہ دنیا اب تو بازار ہے، یہاں آپ کو خریدار خود ڈھونڈنے پڑیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم مٹھائی کی دوکان کھولیں اور اس میں صرف شکر پارے اور افلاطون جیسی مٹھائی ہی بنائیں۔ بھائی اس مٹھاس کو الگ الگ رنگ روپ بھی دے کر آپ جس قسم کی مٹھائی بنائیں گے، اس میں بنیادی چیز مٹھاس تو باقی ہی رہے گی اور مختلف رنگ وروپ سے بھی دوبالا ہو جائے گا۔ خریدار کو بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے انواع واقسام کی مٹھائیاں مل جائیں گی۔ اسی طرح ہمیں اب بازار اور زمانے کے طرز کو دیکھتے ہوئے تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ دعوت وتبلیغ کے لیے بھی نئے نئے طریقے اپنانے ہوں گے۔ جسے ویب سایٹ سے کچھ سیکھنا ہے، اس کے لیے ویب سائٹ مہیا کرائیں، جسے Animated کتابیں پڑھنی ہیں، ایسے بچوں کو ایسی کتابیں فراہم کرائیں، جنھیں سیدھی سادی زبان میں کچھ پڑھنا ہے ان کے لیے ایسی کتابیں تیار کریں، جنھیں فکر وفلسفہ کی باریکیوں کو سمجھنا ہے، ان کے لیے ایسی تحقیقی کتابیں لکھی جائیں۔ جی ہاں! اب وقت آگیا ہے کہ القاب وآداب کی گرانباری سے اپنی تحریروں کو آزاد کریں۔ بچوں اور خواتین کو ذہن میں رکھ کر اعلیٰ حضرت پر کتابیں تیار کریں اور اگر ضرورت پیش آئے اور علماء اجازت دیں تو Animated کتابیں بھی لکھ کر عام بچوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مکتب اور اردو اسکولوں میں زیادہ تر۔۔۔۔۔۔۔۔

چوتھے اور پانچویں سوال کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ ان کے حل کے لیے ہمیں مل کر سوچنا چاہیے کہ ''کیا ہمارے معاشرے میں ایسی تقریب باہتمام ہوتی ہے، جو نئی نسل کے لیے سیکھنے سکھانے

میں معاون ہوں؟'' اور کیا مسجد کی تقریروں میں یا جلسوں میں ایسی سنجیدہ اور سبق آموز باتیں کی جاتی ہیں کہ وہاں سے بچے کچھ سیکھیں؟'' آپ خود بہتر جانتے ہیں کہ ہم نے زیادہ تر مذہبی جلسوں کو کیا بنا رکھا ہے اور کس طرح کی تقریریں کر کے ثواب سے زیادہ، لوگوں کو واہ واہی لوٹنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس پہلو پر بھی بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہم نے تو جلسوں میں آنے والوں کی عادتیں بھی بگاڑ رکھیں۔ وہ تو بس دھوم دھڑاکے والی تقریر ہی سننا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے یہ سوال بھی بہت سنگین ہوگیا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے معاشرتی رسوم ورواج کو بھی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صرف اسی مسئلے پر بیٹھ کر ہمیں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لیے کوئی مناسب ماحول تیار کر سکیں۔

یہ سوال بڑا ہے، کیوں کہ ہمیں اسلاف کی میراث دوسری نسل تک پہنچانی ہے۔

اب ذرا غور کریں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان نے اکیلے وہ کام کیا، جو کئی ادارے مل کر بھی شاید نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے علماء کی ایک ایسی ٹیم کھڑی کر دی، جس کا تسلسل اب بھی جاری ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ بہت ہی معقول اور مناسب (cordial) ماحول میں انہوں نے یہ کام کیا، تمام مخالفتوں کے درمیان رہ کر ایسا کام کیا کہ پچھلی ایک صدی میں ہمارے پاس اس کے سوا کچھ اور اثاثہ ہی نہیں ہے۔ چلو اسے بھی تسلیم کر لیں کہ مجدد تو ایک صدی میں بنتے ہیں تو کیا ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور کسی مجدد کا انتظار کریں۔ اگر اعلیٰ حضرت کو سمجھنا ہوتا، تو ہم صرف فاتحہ درود تک محدود نہیں رہتے اور وعظ ورسوم کو راہ نہ دیتے۔ دراصل ہم نے کیا یہی ہے کہ اس سے آگے سوچنے کی زحمت نہیں کی اور اعلیٰ حضرت کو سمجھنے سے زیادہ ان کی عقیدت پر زور دیا ہے۔ دوسری بڑی غلطی یہ ہورہی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے بعد کی نسل کو ہم نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہوا یہ کہ عقیدت میں ہم اتنے آگے نکل گئے کہ اعلیٰ حضرت سے پہلے اور ان کے ہم عصروں کو بھی جو توجہ ملنی چاہیے تھی، شاید یہاں بھی ہم نے کوتاہی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اعلیٰ حضرت اور علمائے اہل سنت کی میراث ہم تک اس قدر چھن چھن کر پہنچی ہے کہ ہماری رسائی بھی ان تمام سرمائے کی اصل تک نہیں ہورہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے درمیان سے ہی لوگ نکل نکل کر دوسرے عقیدے میں شامل ہورہے ہیں۔ دوسرے لوگ اتنی تیزی سے اور منصوبہ بند طریقے سے کام کر رہے ہیں کہ ان کی تعداد روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ بڑے سنجیدہ مسائل ہیں، جی ہاں غور کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں جم کر مدافعت بھی کرنی ہے اور نئے تقاضوں کے مدنظر نئی کوششیں بھی کرنی ہیں۔ کیوں کہ وہی قومیں زندہ وجاوید اور سرفراز ہوتی ہیں جو اپنے اسلاف کے کارنامے سے نہ صرف واقف ہوتی ہیں

بلکہ اس کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے لیے مشعلِ راہ بناتی ہیں اور اس تسلسل کو آگے بڑھاتی ہیں۔
تہذیب انسانی کے ارتقا کی تاریخ کو دیکھیں یا انسانی اور تمدنی ارتقا کا جائزہ لیں، تو پتہ چلتا ہے کہ وہ قومیں اور ملتیں اپنی شناخت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں، جن کے پاس میراثِ اجداد واسلاف موجود نہیں تھیں۔ آج اقوام عالم میں سب سے بڑا مسئلہ تہذیبی، معاشرتی اور مسلکی شناخت کا ہے۔ بالخصوص ایسے دور میں جب صارفی کلچر اور عالم کاری کی ضربیں پیہم عقیدے، مسلک اور قومیت کے لیے نہ صرف خطرہ بنی ہوئی ہیں، بلکہ اب یہ تمام کے تمام براہ راست ان کے شکنجے میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ تمدنی تاریخ کی ایک حقیقت بھی ہے کہ جب جب تہذیبی اعتبار سے انتشار اور بدامنی کا دور آیا ہے۔ تب تب کسی مجتہد یا صوفی نے ان تاریکیوں سے قوم کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ عراق وشام کی وہ پرفتن شہنشاہیت کا دور رہا ہو یا خلافت کے بدلتے تیور سے اہل ایمان کی پریشانی، ان تمام نازک اور سنگین مرحلوں میں انہی صوفیا نے ہی قوم کو روشنی عطا کی ہے۔ ہندوستان کی سطح پہ دیکھیں، تو جب تہذیبی تصادم اور یلغار کا دور آیا تو ایسے میں اس سرزمین کو تہذیبی انتشار اور دینی ومسلکی تخریب کاریوں سے نجات دلانے کے لیے بھی خدا نے ایک مجتہد عصر کو یہ ذمہ داری سونپی۔ خدا کی جانب سے ودیعت کردہ دینی علم اور عصری شعور کے ساتھ امام احمد رضا قدس سرہ نے نہ صرف اس پرفتن دور میں علم کی شمع روشن کی بلکہ عقیدے اور ایمان کی بھی حفاظت فرمائی۔ ہر دور میں ایسے رہنما وقت کے تقاضے کے تحت قوم کی رہبری کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں اصلاحی تناظر کے پس منظر میں دیکھیں، تو ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ راجہ رام موہن رائے سے لے کر سرسید احمد خان تک۔ مگر ان میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ انہیں محض تہذیبی سطح پہ کوششیں ثمر آور تو ہوئیں، مگر نورِ ایمان سے خالی رہیں، کیوں کہ انہوں نے مادیت کو ترجیح دی۔ لیکن خانقاہوں اور صوفیائے کرام نے بڑا کارنامہ یہ کیا کہ انہوں نے اپنے دروازے سبھوں کے لیے کھول دیے، وہ ہندوستان جو ذات پات کی رسم کے سبب آپس میں ہی اتنی دیواروں اور حصاروں میں گھرا تھا کہ اُن سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ اتنی دیواریں اٹھیں ہیں ایک گھر کے درمیاں گھر کہیں گم ہو گیا، دیوار ودر کے درمیاں۔ لیکن ہندوستان کے صوفیا اور خانقاہوں نے ان دیواروں اور حصاروں کو توڑ کر لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ انہوں نے نہ صرف مذہب کی تعلیمات کو عام کیا، بلکہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں سب سے نمایاں کام کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی انہیں خانقاہوں میں سے ایک خانقاہ یعنی مارہرہ مطہرہ پر جبیں سائی کی۔ انہیں بھی روشنی یہیں سے ملتی ہے اور عظیم خانقاہ کے عظیم سپاہی ہونے کے ناطے انہوں نے ملک وقوم اور سنیت کے لیے جو کام کیا، وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے، معذرت کے ساتھ یہ عرض

کرتا چلوں کہ ہمارے اسلاف نے خانقاہ اور علم کے مرکز کو جو یکتائی کا تصور دیا تھا، اسے ہم نے دوئی میں بدلنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں روحانی اور علمی مرکز میں جو خلیج پیدا کردی ہے۔ اس سے بھی کئی بڑے مسائل آن کھڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس خلیج کو پاٹنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس قوم کو جس نے روایات کے انبار میں دب کر توہمات اور دینِ فطرت سے دور رسوم ورواج کو اپنا نصب العین بنالیا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ قوم اور نئی نسل کو ان مراکز خانقاہ اور علمی مرکز کی صحیح اور سچی تعلیم اور خدمات سے آگاہ کیا جائے۔

امام احمد رضا کی بھی سب سے بڑی دین ملتِ اسلامیہ (اسلامیہ اس لیے کہ ان کی خدمات کا دائرہ محض ہند کی سرزمین تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کے عالمگیر اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں) کے لیے یہ ہے کہ انہوں نے ان رسوم ورواج کو جو غیر ضروری طور پر اسلام کے ماننے والوں میں داخل ہورہے تھے، ان کی جانب نہ صرف اشارہ کیا، بلکہ تحریر، تقریر اور علمی طور پر اس کے انسداد کی کوششیں کیں۔ ان کی ان کوششوں کو لوگ معمولی بھی سمجھ سکتے ہیں، مگر سچائی یہ ہے کہ اگر اس عہد میں یہ کوشش نہیں ہوئی ہوتی، تو اس قوم (بالخصوص ہندو پاک کی) کو اپنی اصلاح کرنے اور صحیح راہ تلاش کرنے میں کئی صدیاں لگ جاتیں۔ اور مادیت کے اس دور میں دین وایمان کی تفہیم جوئے شیر لانے کے مصداق ہوتی۔

اس لیے ہم جو امام احمد رضا کے ماننے والے ہیں، ان پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے ہم دین وسنیت کے فروغ کے لیے کوشش کریں۔ آج چوں کہ تخصیص کا زمانہ ہے، اس لیے ہمیں بھی الگ الگ گروپ کو ٹارگیٹ کر کے مختلف صلاحیتوں کا استعمال کرنا ہوگا۔ تاکہ عہد حاضر کے مسائل سے نپٹ سکیں۔

آج امام احمد رضا کی دینی اور ملی خدمات کو صرف سراہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن شخصیات کو ہم نے بہت چاہا اور جن کی عظمت کا ہم نے اقرار کیا ہے، ان کو سمجھنے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ اس طرح وہ شخصیت ہماری عقیدت وعظمت کے محدود دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ امام احمد رضا کے حوالے سے بھی یہی ہورہا ہے کہ ان کے ماننے والوں کی اکثریت ایسی ہے، جو ان کے نام سے واقف تو ہیں، مگر ان کے کارناموں سے واقف نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام جابر مصباحی صاحب کی کوششیں یقیناً قابل صد آفریں ہیں کہ انہوں نے اس سیمنار کا اہتمام کر کے اس سمت میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو قبول فرمائے آمین۔

پروفیسر ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

کمالاتِ رضا کے اعتراف کی صورتیں

عام طور پر انسانوں کو جو صلاحیتیں خالقِ کائنات کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں ان کی بنیاد پر کسی ایک فن کسی ایک شاخِ علم کسی ایک ہنر یا کسی ایک صیغے میں مہارت بہم پہنچا کر انسان مرتبۂ کمال حاصل کر لیتا ہے جو اس کی شہرت ناموری اور عزت کا سبب ہوتا ہے۔ کچھ غیر معمولی افراد بیک وقت دو یا دو سے زیادہ صیغۂ ہائے علم و ہنر میں کمال حاصل کر کے یکتا و بے مثال بنجاتے ہیں، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ متعدد علوم و فنون میں مہارت تامہ حاصل کر کے انسان ایسی مثال قائم کر کے کہ جسے مستقبل میں کوئی چیلنج ہی نہ کر سکے۔ انسانی ارتقا کی تاریخ میں آخر الذکر طبقہ کے افراد کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔ ایسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنے فضل و کمال سے پوری صدی بلکہ آنے والے زمانوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ایسی شخصیتوں کے کمال کا احاطہ کرنے والی اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح مجدد بھی ہے جس کا اطلاق بجا طور پر ۱۹ ویں صدی کے معروف عالمِ دین، فقیہ، محدث، ادیب اور شاعر بے مثال مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی (۱۹۲۱ـ ۱۸۵۶ء) پر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ فاضل بریلوی کے علاوہ اس اصطلاح کا استعمال حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس پر برصغیر کے تمام مکاتیب فکر متفق ہیں۔ کم از کم راقم آثم نے تو آج تک حضرت شیخ احمد سرہندی اور فاضل بریلوی کے علاوہ کسی فرقے کے کسی عالم کے نام کے ساتھ مجدد کا لقب نہیں دیکھا۔

فاضل بریلوی کے کمالات کا سلسلہ ہمہ جہت ہے۔ علوم عقلی و نقلی مہارت کے ثبوت کے طور پر آپ کی تصانیف پیش کی جاسکتی ہیں۔ آپ کا صرف ایک کارنامہ ایسا ہے کہ جس کی مثال بلاخوف تردید بحر ذخار سے دی جاسکتی ہے۔ وہ کارنامہ ہے فتاویٰ رضویہ۔ بہ ظاہر تو یہ فقہی اور عائلی استفسارات کے جواب میں احکامِ شریعت کا مجموعہ ہے لیکن ان استفسارات کے جوابات کے پس پشت جس عمیق مطالعے اور وسیع مشاہدے کا عطر شامل ہے اس نے فتاویٰ رضویہ کو مجموعہ احکامِ شریعت سے درجنوں بلند علوم عقلی کے نکات کا گلدستہ بھی بنادیا ہے۔ فاضل بریلوی کی تصانیف بطور عام اور فتاویٰ رضویہ بطور خاص کا مطالعہ صاحبان علم پر روشن کرتا ہے کہ ان تحریروں میں جہاں علوم نقلی و علوم قدیمہ کا انبار ہے وہیں علوم جدیدہ اور سائنس و ریاضی کے مضامین بھی اپنی شان دکھلا رہے ہیں۔ علم ریاضی، علم کیمیا، علم فلکیات، ارضیات، نجوم، رمل، بین الاقوامی قانون، عمرانیات، معاشیات، منطق، فلسفہ وغیرہ متعدد علوم پر حاکمانہ اور استادانہ اور عالمانہ گرفت بلکہ عبور فاضل بریلوی کا وہ کارنامہ ہے ان کے عہد کے مذکورہ بالا علوم کے ماہرین نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان علوم میں سے اکثر پر فاضل بریلوی کی کتابیں موجود ہیں جن میں خالص علمی انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ جن علوم پر باضابطہ کتب یا رسائل تحریر نہیں فرمائے ان کا تفصیلی ذکر یا حوالہ مختلف استفسارات کے جواب میں فتاویٰ رضویہ میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر تیمم اور طہارت کے تعلق سے کیے گئے استفسار کے جواب میں مٹی اور پانی کے خواص اور اقسام پر جب گفتگو شروع فرمائی تو اس موضوع کے حوالے سے علمی موشگافیوں کا ایک طویل سلسلہ قائم کردیا۔

ایسی تحریر ہماشما کے سمجھ میں خاک آئے گی۔ ایسی تحریر کو کما حقہ پرکھنے اور اس پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری ہے کہ قاری ان علوم پر دسترس رکھتا ہو اور Geology اور Water resource سے متعلق علوم کے قدیم و جدید دبستانوں اور اس میدان میں ہونے والی تحقیقات سے واقف ہو۔ سائنس میں نظریات کے تغیر کا سلسلہ رہتا ہے ان تغیرات اور تبدیلیوں پر بھی قاری کی نظر ہونی چاہیے پھر وہ فاضل بریلوی کے اعتراف کا حق ادا کرسکتا ہے۔

فاضل بریلوی کی نعتیہ رباعی کا ایک مصرعہ ہے ع

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی

اس مصرعہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے فاضل بریلوی کی عقیدت اور آپ کی نعت بیان کرتے وقت تقدس اور احترام کی جس فضا کی جانب اشارہ ہے اور اس مصرع سے ہی فاضل بریلوی کے عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا جو اندازہ ہوتا ہے اس پر گفتگو انشاء اللہ پھر کسی صحبت میں، سردست عرض یہ کرنا ہے کہ فاضل بریلوی نے صرف نعت گوئی ہی قرآن سے نہیں سیکھی بلکہ جملہ علوم پر اظہار اور گرفت کا انداز بھی آپ نے قرآن سے ہی سیکھا ہے۔ قرآن بظاہر تو الہامی کتاب ہے جو پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی جس میں اللہ کی عبادت اور اللہ ورسول کے حقوق کی ادائیگی کا حکم اس کے بندوں کو دیا گیا ہے نیز جنت وجہنم اور جزا وسزا وغیرہ کا بیان ہے۔ لیکن کیا واقعی قرآن صرف انہیں مقدمات تک محدود ہے؟ نہیں اور قطعی نہیں اس طرح کا بیان دینے والا قرآن سے نابلد اور ناواقف کہلائے گا۔ قرآن تو وہ کتاب ہے جس میں علوم عقلی کی ایسی باریکیاں چودہ سو برس پہلے بیان کردی گئی ہیں جن کو جدید سائنس آج دریافت کررہی ہے۔ دوسری چیز صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ ہیں جنہیں احادیث کہتے ہیں۔ احادیث بھی قرآن حکیم کی طرح احکام وفرائض وواجبات کے بیان کے ساتھ ساتھ علمی اور سائنسی موضوعات پر جس طرح اظہار کرتی نظر آتی ہیں ان پر جدید تحقیق کے طالبان علم حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

اس طرح فاضل بریلوی کی تحریروں کی صورت ہے کہ اصلاً ان کا موضوع مذہب اسلام سے متعلق ہوتا ہے لیکن وضاحت اور تفصیلات کے ہنگام میں فاضل بریلوی کا قلم جدید علوم کے قلمرو میں داخل ہوکر نہایت پروقار انداز میں اپنے کمال اور اپنی فضیلت کے سکے بٹھاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے نعت گوئی کی طرح علوم وفنون سب کے سب قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہیں۔

فاضل بریلوی کی علوم جدید سے متعلق معلومات اور ریاضی وفلکیات وغیرہ علوم پر گرفت کی مثالیں ان تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۱۹ء کے اس واقعہ سے بھی فاضل بریلوی کی مہارت علم فلکیات کا اندازہ ہوتا ہے میں امریکی ہیئت داں پروفیسر البرٹ ایف پورٹا نے ایک ہولناک پیشین گوئی کی کہ ''۱۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو آفتاب کے سامنے بعض سیاروں کے جمع ہونے اور ان کی کشش سے آفتاب میں ایک بڑا گھاؤ نمودار ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا میں قیامت آجائے گی، آندھیاں طوفان اور زلزلے دنیا کے بہت سے علاقوں کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ یہ خبر پٹنہ کے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہوئی اور اہلِ وطن بے چین ہو گئے۔ یوروپ اور امریکہ تو اس پیشین گوئی سے بے چین تھے ہی ہندوستان میں اس خبر کی اشاعت سے برصغیر میں تہلکہ مچ گیا۔ حضرت مولانا ظفر الدین بہاری ملک العلماء رحمۃ اللہ علیہ نے اس اخبار کا تراشا اپنے استاد مرشد فاضل بریلوی کی خدمت میں بھیجا اور اہلِ وطن کی بے چینی سے آپ کو واقف کرایا۔ فاضل بریلوی نے ملک العلماء کو جواب میں تحریر فرمایا:

''آپ کا پرچہ اخبار آیا، نواب صاحب نے ترجمہ کیا کسی عجیب بے ادراک کی تحریر ہے جسے ہیئت کا ایک حرف نہیں آتا سراپا اغلاط سے مملو ہے۔'' (محررہ ۱۴ر صفر ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء)

اس کے بعد فاضل بریلوی نے پورٹا کے جواب میں ایک محققانہ رسالہ لکھا جس کا تاریخی نام ''معین مبین بہر شمس وسکون زمین'' (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) ہے۔ اس رسالے میں فاضل بریلوی نے پورٹا کے بیان پر کہ ''۱۷ر دسمبر کو دنیا تباہ ہوجائے گی'' ۱۷ر مواخذات کیے اور علم ہیئت سے متعلق فاضلانہ بحث کی ہے۔ آخر میں تحریر فرمایا:

''بیان منجم پر اور مواخذات بھی ہیں مگر ۱۷ر دسمبر کے لیے ۱۷ر ہی پر اکتفا کرتا ہوں واللہ اعلم''

یہ رسالہ اردو میں تھا اور اردو میں ہی ہے لہٰذا فاضل بریلوی کے افکار سے پروفیسر پورٹا واقف نہ ہوسکا ورنہ جس طرح ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء سے پہلے فاضل بریلوی نے اس کی پیشن گوئی پر ۱۷ر مواخذات قائم کرکے اس کے بیان کو باطل کر دیا تھا اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو بالکل خیریت رہنے اور کسی فلکی واقعہ کے رونما نہ ہونے کے سبب سے پروفیسر پورٹا غلط بھی ثابت

ہو گیا تھا، وہ ضرور بریلی حاضر ہو کر پروفیسر سر ضیاء الدین اور سابق وائس چانسلر اے ایم یو، علی گڑھ کی طرح نیاز مندی کا اظہار کرتا۔

گزشتہ سطور کے ذریعہ راقم یہی عرض کرنا چاہتا ہے کہ فاضل بریلوی کی علمی حیثیت اور ان کے مراتب کے تعلق سے بہت سارے پہلو تشنہ ہیں۔ ہمارے علما کی تحریروں سے ان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ انہیں ایک خاص مکتبۂ فکر کا داعی اور دوسرے مکاتیب فکر کے خلاف شمشیر برہنہ ثابت کرتا ہے۔ جبکہ فاضل بریلوی کے علمی اکتسابات پر غیر جانب داری کے ساتھ ریسرچ کا بڑا کام باقاعدہ تو شروع بھی نہیں ہوا الا ماشاء اللہ پروفیسر ضیاء الدین احمد (علی گڑھ) پروفیسر محی الدین الوائی (ازہر مصر)، پروفیسر بار برامٹکاف (کیلیفورنیا)، پروفیسر ابرار حسین (پاکستان) کے اعترافات اور تحریریں فاضل بریلوی کے کارناموں کے سامنے بہت قلیل ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کمالات رضا کے اعترافات کا کام اکادمی کی سطح پر منضبط طریقے سے کیا جائے۔ مثلاً:

☆ فاضل بریلوی نے اپنی تحریروں میں کتنے علوم کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اس کی تحقیق کی جائے۔

☆ علوم عقلی کے بارے میں جدید نظریات کی روشنی میں ماہرین علوم کا ایک بورڈ فاضل بریلوی کے خیالات کا مطالعہ کرے۔

☆ فاضل بریلوی کے علوم عقلی سے متعلق تمام تحریروں کا ترجمہ ایمان دار اور منصف مزاج مترجموں کے ذریعہ انگریزی میں کروایا جائے۔

☆ علوم عقلی کے مراکز میں مختلف شعبوں کے سنجیدہ ریسرچ اسکالرس سے فاضل بریلوی کے ذریعہ اس مخصوص صیغۂ علم میں کی گئی تحقیق پر مقالات لکھوائے جائیں۔

☆ محققین کو فاضل بریلوی کے نظریات پر آزادانہ گفتگو کرنے کی اجازت ہو اور عقلی علوم کے تعلق سے فاضل بریلوی کے خیالات پر ماہرین سے تنقیدی مضامین لکھوائے جائیں۔

☆ مغربی ماہرین کو ترجمہ کے ذریعہ فاضل بریلوی کے خیالات مہیا کرائے جائیں اور ان سے ان افکار و خیالات کی آزادانہ تعیین قدر کروائی جائے۔

☆ علوم عقلی کے ریسرچ اسکالرس کو فاضل بریلوی کی علمی خدمات پر تحقیقی مضامین لکھنے کے لیے مالی تعاون دیا جائے۔ اور سنجیدگی سے پروگرام بنا کر غیر جانبدارانہ واقف دنیا کو بتایا جائے کہ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد دکنی

شعبۂ اردو و فارسی

گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ، کرناٹک

امام احمد رضا خاں بریلوی کا ادبی افق

امام احمد رضا کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ پہلو رہی ہے، جہاں وہ ایک طرف جید عالمِ دین، مفکر، مصلح اور صوفی باصفا ہیں، وہیں دوسری طرف نعت گو شاعر اور صاحبِ طرف ادیب کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے آج بھی مولانا کا عملی اور روحانی فیض کا چشمہ رواں دواں ہے۔

امام احمد رضا خاں کا خمیر خیر کی مٹی سے اٹھا ہے، اس مٹی سے جہاں علم و فضل درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی کھنک اس مٹی میں شامل تھی۔ مولانا کی پرورش خالص مذہبی اور علمی ماحول میں ہوئی، ایسے ماحول کا پروردہ جب شعر تخلیق کرے گا، تو اس کی اثر آفرینی اور روحانی کیفیات سے سارا عالم کیف و سرور اور سرمستی عشق سے معمور ہوگا۔ اس کیف و نشاط کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں، جن کے ذہن و قلب پہلے سے ہی اس کیفیت سے آشنا ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں، عشق کی پاکیزگی اور اثر آفرینی کی مثالیں۔

یاالٰہی جب رضا خواب گراں سے سر اٹھائے — دولت بیدار عشق مصطفیٰ کا ساتھ ہو
واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا — اونچے اونچے کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا
لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے — اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے
وہ زباں جس کو سب کن کی کنجی کہیں — اس کی نافذ حکومت پہ لاکھوں سلام
ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں — جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیے ہیں

امام احمد رضا کی شاعری میں عشقِ رسول کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کا گویا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے، جس میں فکر و فلسفہ، نفسیات و منطق، سیاسیات و سماجیات معاشیات و تجارت اور سائنس واخلاقیات وغیرہ کی کلیاں بھی معلوم ہوتی ہیں، وہ ایک ماہر فن کی طرح قوسِ قزح کے ہر رنگ

کو بحسن وخوبی پیش کرتے ہیں، جس کے باعث ان کے وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدہ اور طویل مجاہدہ کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق مولانا زائد از (۷۵) علوم وفنون میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔نمونے کے طور پر مولانا کے تین شعر ملاحظہ فرمائیں، جس میں سائنس، منطق اور نفسیات جیسے علوم کی کارفرمائی نظر آتی ہے:

محیط ومرکز میں فرق مشکل رہے نہ فاصل خطوطِ واہل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے

سببِ ہر سبب منتہائے طلب
علتِ جملہ علت پہ لاکھوں سلام

سرکار ہم گنواروں میں طرزِ ادب کہاں
ہم کو تو بس تمیز یہی بھیک بھر کی ہے

نعتیہ شاعری میں امام احمد رضا نے مختلف فکروفن کو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اپنی شاعری کا محور ومرکز بنایا ہے اور ایک نئے بابِ سخن کا در کھولا ہے، جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مولانا کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے فنِ نعت گوئی کو معراج عطا فرمائی ہے، جس میں عقائد کی پختگی، ایمان کی اکملیت اور عشقِ رسول کو نمایاں کیا ہے اس وصفِ خاص کو دادِ تحسین پیش کرنے کے لیے ذہن وفکر کی پاکیزگی ہونی چاہیے۔

امام احمد رضا کی تصنیف لطیف ''حدائق بخشش'' ان کے تبحر علمی کا ایک حسین مرقع ہے، جس میں شامل کلام آج بھی برصغیر ہندوپاک کے چپہ چپہ میں گونج رہا ہے، بالخصوص ''مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' پوری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو سلام ہے اور اس کی ادبی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، جس میں فکروفن پورے شباب پر نظر آتا ہے۔حدائق بخشش کے مطالعہ کے بعد یہ احساس جاگزیں ہوجاتا ہے کہ امامِ نعت گویاں کے فکروفن میں تخلیقی ادب نے اعتبار پایا ہے، اگر وہ مکمل طور پر حرف ادب وشعر کی طرف توجہ دیے ہوتے، تو یقیناً اردو شعروادب میں انقلاب برپا ہوسکتا تھا۔شاعرِ لکھنوی نے سچ ہی کہا تھا:

''رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری جذبے کی پختگی کے علاوہ ایسی بے شمار فنی خوبیوں کی حامل ہے، جن کی مثال اس دور کے شعراء میں بہت کم ملتی ہے'' (دبستانِ رضا مرتبہ: یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ رضوی کتاب گھر دہلی، ص:۹۸)

مولانا احمد رضا کی شاعری کا ادبی مقام و مرتبہ بلند و ارفع رہا ہے، چوں کہ مولانا اہل زبان تھے اور شعر گوئی کے لیے حضرتِ رضا کی طبیعت مناسبت رکھتی تھی، عالم و فاضل ہونے کی وجہ سے عربی و فاسی زبانوں میں دسترس حاصل تھی، جس کی وجہ سے ان کے یہاں ادبی لوازم اور فکر وفن بام عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ عربی و فارسی زبانوں کے علاوہ مولانا نے ہندی اور سنسکرت الفاظ اور ہندوستانی محاورات اور کہاوتوں کا تخلیقی استعمال کیا ہے ان کے یہاں فصاحت، بلاغت اور زبان کی چاشنی، حسین ودلکش مرکبات کے استعمال نے ان کے کلام کو منفرد اسلوب کا حامل بنا دیا ہے۔ غرض مولانا نے نعت گوئی میں اپنی تخلیقی رویہ کے باعث اپنے ہم عصروں میں انفرادی شانِ اور امتیازی وصف حاصل کیا ہے۔

لم یاتِ نظیرک فی نظرٍ مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سرسو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا
صبا وہ چلے کہ باغ پھلے وہ پھول کھلے کہ دن ہو بھلے
لوا کے تلے ثنا میں کھلے رضا کی زباں تمہارے لیے
بچا جو تلوؤں کا ان کے دھون بنا وہ جنت کا رنگ وروغن
جنہوں نے دولہا کی پائی اترن وہ پھول گلزار نور کے تھے

اردو شاعری میں میر، غالب اور اقبال کو شعری مجدد کی حیثیت حاصل ہے، یہ شعری مجددی مثلث بالترتیب تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے شاعر کہلائے جاتے ہیں، مگر امام موصوف کے کلام کا جائزہ لیا جائے، تو یہ مثلثِ شعری ٹوٹ کر مستطیل بن جاتا ہے اور اس مستطیلی رقبہ میں ان تینوں شاعروں کے اوصاف کا مرقع امام احمد رضا کی ذات والا صفات ہے، مولانا کے یہاں تشبیہات واستعارات کی جدت وندرت، الفاظ کی شگفتگی وتازگی، خیالات کی بلندی، جذبات واحساسات کی پاکیزگی، لفظوں کا درست اور حسین انتخاب، غنائیت وموسیقیت اور نادر تلمیحات کا استعمال امامِ نعت گویاں کو قادرالکلام شاعروں کے زمرے میں رکھتا ہے۔ پروفیسر حمید اکبر صدر شعبۂ اردو وفارسی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، گلبرگہ یونیورسٹی اپنے ایک مضمون ''اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں امام احمد رضا کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں:۔

''......ان متذکرہ تمام شواہد کے پیش نظر دور تقدیم سے لے کر آج تک اگر اردو نعتیہ شاعری کا فنی یا لسانی تجزیہ کیا جائے، تو اکابر نعت گوشعرا میں مولانا احمد رضا خاں کا اردو زبان کی ترقی وترویج میں

وافر حصہ نظر آتا ہے مولانا احمد رضا خاں بریلوی حدف شاعری پر ہی اکتفا کر لیتے، تو آج اردو دنیا میں ان کا مقام میر و غالب سے کم نہ ہوتا''۔

(اذکار اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج میں علمائے کرام کا حصہ، ناش کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور)

خورشید تھا کس زور پر کیا بڑھ کے چمکا تھا قمر	بے پردہ جب وہ رخ ہوا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
نہ رکھی گل کے جوشِ حسن نے گلشن میں جا باقی	چٹکتا پھر کہاں غنچہ کوئی باغِ رسالت کا
جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آگیا	اس نگاہ عنایت پہ لاکھوں سلام
اتنی رحمت رضا پہ کرلو	لاَیَقْرَبہ البواد --- آقا

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جو بن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لیے تھے

شاخِ قامت شہ میں زلف وچشم ورخسار ولب ہیں
سنبل نرگس گل پنکھڑیاں قدرت کی کیا پھولی شاخ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ذہن ودل کے ہر بڑے موڑ سے گزرنے والے نعت گو شاعر مولانا امام احمد رضا خاں نے جہاں اپنے نثری اسلوب سے علمی نثر کو جام عروج پر پہنچا دیا، وہیں اردو نعتیہ شاعری کو اوجِ ثریا تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ غرض مولانا کی عشقِ محمدی میں ڈوبی ہوئی نعتیں بے ادبوں کے لیے عبرت ونصیحت کا سامان فراہم کر رہی ہیں، اس کے علاوہ ان نعتوں میں حسنِ بیان اور فنِ بالیدگی اپنے معروجِ کمال پر دکھائی دیتی ہے، فصاحت وبلاغت سے لبریز کلام قاری کو مسرت، بصیرت وبصارت اور عشقِ محمدی کی سرمستی کی وادیوں میں لے جاتا ہے، اس طرح عشق کی حقیقی شمع فروزاں ہوتی ہے، جس سے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں کا دل عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جھلک والفت میں دل جھوم اٹھتا ہے اور دل سے یہ صدا گونجتی ہے کہ

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری، بمبئی

عصر حاضر میں فکر رضا کی معنویت واہمیت!

خدا کے فضل سے ایسا ہے چرچا اعلیٰ حضرت کا
نظر آتا ہے چاروں سمت جلوہ اعلیٰ حضرت کا
زمانہ گھر رہاہ ہے تیرگی فکر میں اب تو
لگاؤ جھوم کر مسلک کا نعرہ اعلیٰ حضرت کا

ہمارا یہ دور کئی اعتبار سے قابل ذکر اور اہم ہے، آج علوم وافکار کی جتنی شاخیں، تفضّل وبصیرت کی جتنی راہیں، اور تدبر وتجس کی جتنی مثالیں موجود ہیں شاید ہی کبھی موجود رہی ہوں، کمپیوٹر کی کرشماتی ادواؤں نے اچھے اچھوں کو غرق حیرت کر دیا ہے، نت نئی ایجادات سے عالم کی آنکھیں خیرہ ہیں، ان تمام چیزوں کے باوجود ان میں کمی یہ ہے کہ طاقتور فکر کمزور فکر کہیے ہر لمحہ چیلنج بنی ہوئی ہے اور ہم اپنی نظروں سے آئے دن افکار کا تاج محل اٹھتے اور ملبوں کا ڈھیر بنتے دیکھ رہے ہیں، افکار کے وجود کا ہی خطرات میں گھرا رہنا یہ بڑا المیہ ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ افکار انسانی دفاع کی پیداوار ہیں، آج ایک کتاب مارکیٹ میں آئی، علوئے فکری کا خوب چرچا ہے، مطالعے کی میز پر سجنے لگی، پذیرائی کی نسیم سحری میں ارباب ہوش خود بخود مدہوش ہو گئے، ابھی مقبولیت کا عین شباب ہی تھا کہ دوسری اس سے اعلیٰ فکر ومعیار کی حاصل کتاب مارکیٹ میں آگئی، اب وہ سارے اوصاف اس نئی کتاب کے دامن سے سجا دیئے گئے، نئی فکر کے آتے ہی بلوائی فکر شک وارتیاب کے گرداب میں پھنس گئی، یہ انسانی فکر ہے جو دفاع سے شروع ہوتی ہے اور دفع ہی پر ختم ہو جاتی ہے، اس کی ابتداء بھی دماغ اور انتہا بھی دماغ، تاہم ایک فکر اور ہے جو دفاع سے شروع ہوئی ہے اور دل پر ختم ہوتی ہے، ان دونوں میں بین فرق یہ ہے کہ جس فکر کی انتہا دماغ ہے اس کے مقدر میں

فنا ہے، اور جس فکر کی انتہا دل ہے اس کے مقدر میں بقا ہے، وہ فکر جس کی ابتدا دماغ اور انتہا دل ہے وہ صرف وہ فکر ہے جس کا منبع قرآن وحدیث، کتاب وحکمت ہے، پہلے والی فکر مخلوق کی فکر ہے اور دوسری فکر خالق مخلوق کی فکر ہے، اسی کو ڈاکٹر محمد اقبال نے دانش برہانی اور دانش نورانی سے تعبیر کیا ہے، ہر دو افکار کا معدن دماغ ہر دور میں موجود رہا ہے انہیں سے بزم حیات وکائنات رونق افروز ہوتی ہے، یہی اپنے اپنے معاصرین اصاغرین کے لیے سرمایۂ بصیرت ثابت ہوتے ہیں، مگر دانش نورانی کے حاملین کی بات ہی کچھ اور ہے، ان کے بچپنے میں جو تروتازگی ہوتی ہے، ان کی جوانی میں جو دم خم ہوتا ہے، اور ان کے بڑھاپے میں یقیں محکم، عمل پیہم کی جو سامانی ہوتی ہے وہ کسی اور کے نصیب میں کہاں؟ مثلاً اب سے ایک سو چون برس پہلے اسی ملک ہندوستان میں ایک بچہ زینت بخش ـ ـ ـ ـ ـ ہوتا ہے، دوسرے بچوں سے بالکل الگ تھلگ اسکی اٹھان ہے۔ وہ فکر تابندہ کا ایک ایسا جہان ہے کہ ساڑھے تین سال کی عمر میں پہلی بار مکتب میں بیٹھتا ہے اور ایک انوکھے سوال سے اپنے استاذ کو سراپا سوال بنا دیتا ہے، چھ سال کی عمر میں اس کے ذہن ـ ـ ـ ـ کی وہ پرواز کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سنہرے موقع پر میلاد مصطفے کے موضوع پر دو گھنٹہ خطاب کرتا ہے، اور علوم ومعارف کے وہ دریا اچھالتا ہے کہ عوام وخواص کا مرکز توجہ بن جاتا ہے، دس سال کی عمر آتے آتے درسیات کی کئی مغلق کتابوں کی شرح لکھ ڈالتا ہے اور استاذ ان زمانہ کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے، ۱۳؍سال، دس ماہ، پانچ دن جب اس کی عمر ہوتی ہے، تو وہ مروجہ وغیر مروجہ علوم اسلامیہ وعصریہ کے سمندر کو عبور کر کے سند فراغت حاصل کر لیتا ہے اور فارغ ہوتے ہی افتا جیسے ذمہ دار مسند پر رونق افروز ہو کر دین وشریعت، قوم وملت کی الجھی گتھی کو سلجھانے لگتا ہے اور اس خوش اسلوبی اور شان اسغناء سے اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے کہ دنیائے اسلام کا بالخصوص مرجع، اور ساری دنیا کا بالعموم مشار الیہ بن جاتا ہے اپنے خزینۂ افکار سے جس نے نوخیزی ہی میں دنیا مٹھی میں کر لیا تھا اسی مفکر اعظم عالم آج ہم آپ سب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں اور مانتے ہیں، یہ دانش نورانی کی نوری برکات تھیں جس نے بریلی کے احمد رضا کو پوری دنیا کا اعلیٰ حضرت بنا دیا، برصغیر کی تاریخ میں فکر رضا کی جامعیت اپناوہ انوکھا ریکارڈ

رکھتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے، اپنا جواب خود ہے، وہ کتنے علوم وافکار پر مہارت وممارست رکھتے تھے اس تعلق سے پہلے پہل یہ کیا گیا کہ وہ ۵۹ علوم وفنون کے ماہر ہیں، تحقیق آگے بڑھی تو یہ تعداد ۷۵ تک پہنچ گئی، مزید تلاش وکوشش ہوئی تو ۱۰۵ ر کی فہرست سامنے آئی، پھر محققین نے دیدانداز تحقیق میں تجسس وتفحص کی میز سجائی تو ہوتے ہوتے اب یہ تعداد ۳۰۵ تک پہنچ گئی ہے، امام احمد رضا کے علوم فنون کی اس بہتات کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، عالم اسلام میں ایسی بہت سی شخصیات گزری ہیں جو سینکڑوں علوم وفنون پر فاضلانہ گرفت رکھتی تھیں، حضرت الشاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ ۱۵۰ ر علوم فنون پر مہارت رکھتے تھے، حضرت الشاہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۱۸۸ ر اور صاحب بند اس علامہ عبدالعزیز پاروی ۲۷۰ علوم وافکار کے تاجدار تھے، تو آج کے علوم وافکار کے چقاچق دور میں امام احمد رضا ۳۰۵ علوم وافکار پر قدرت کامل رکھتے تھے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے اور تعجب اس لیے بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اعلیٰ حضرت کے علوم کا مطمح ،فکر کا سرچشمہ کتاب مبین ،قرآن حکیم ہے ،اور قرآن مجید کے تعلق سے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لاتنقضی عجائبہ قرآن مجید کے معارف عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ خود قرآن مجید میں کتنے علوم وفنون ہیں اس نسبت سے کوئی حتمی تعداد متعین کرنا مشکل ہے تاہم فیض نبوت سے فیض یاب حضرات نے اس بارے میں جو ارشاد فرمائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی قاضی ابوبکر ابن عربی کا قول نقل کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے علوم ۷۷۰۰۰ ہزار ہیں، علامہ بیجوری نے قصیدہ بردہ کی شرح میں فرمایا کہ قرآن مجید کی ہر آیت کے ۶۰۰۰۰ مطالب ہیں۔ حضرت علی خواص قدس سرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۂ فاتحہ کے معانی پر مطلع فرمایا تو اس سے میرے لیے ۱،۴۹۰۹ (ایک لاکھ چالیس ہزار نوسونو) علوم منکشف ہوگئے، خود اعلیٰ حضرت علوم قرآنی پر کیسی گہری نظر رکھتے تھے وہ اس تعلق سے یہ عرض ہے کہ محبّ رسول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ کے عرس میں تشریف لے گئے تو وہاں ۹ بجے سے ۳ بجے تک کامل چھ گھنٹہ سورۂ والضحیٰ پر تقریر فرمائی اور فرمایا کہ اس سورۂ مبارک کی کچھ آیات کی تفسیر ۸۰ جز یعنی پچیس سو صفحات لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ اتنا وقت کہاں سے لاؤں کہ پورے قرآن کی تفسیر لکھ سکوں، مولانا اطہر

نعیمی اپنے والد شیخ التفسیر مفتی محمد عمر نعیمی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ فاضل بریلوی تقریر بہت کم فرمایا کرتے تھے، سال میں صرف تین خصوصی تقریر معمولات میں شامل تھیں، لیکن تمام تقریریں سورۂ فتح کی پہلی آیت پر ہوتیں اور ہر مرتبہ نئے نکات بیان فرماتے، تقریر کا یہ سلسلہ تقریباً پچاس سال تک قائم رہا، سوچنے کی بات ہے جو صرف ایک آیت پر نئے نئے نکات کے ساتھ پچاس سال تقریر کرسکتا ہو، سورۂ والضحیٰ کی چند آیات کی تفسیر ٢٥ صفحات میں لکھ سکتا ہے، وہ اگر کچھ نہیں کرتا صرف تفسیر میں لکھتا تو یقیناً الماری کی الماری برس گئی ہوتی اور وہ تفسیر دنیا کی سب سے ضخیم وعظیم تفسیر ہوئی۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ جس دور میں اعلیٰ حضرت اپنی حیات کے آسمان کو افکار کی کہکشاں سے سجا رہے تھے اسی دور میں منفی افکار بھی لگاتار جنم لے رہے تھے، تاہم ان تمام افکار کا اعلیٰ حضرت کے افکار سے مخلصانہ موازنہ کیجیے تو صرف اعلیٰ حضرت کی فکر ہے جو فکر قدیم کی پاسبان وترجمان نظر آتی ہے، بقیہ کوئی جس فکر، نہ صرف یہ کہ فکر قدیم کی میزان پر پوری نہیں اترتی بلکہ فکر قدیم سے متصادم نظر آتی ہیں، افکار عالم کے ہجوم میں صرف فکر رضا تھی جو گنبد خضرا کا بوسہ لے کر قرآن وسنت کا طواف کرتی دکھائی یتی ہے، حالات اتنے مخدوش تھے کہ اچھے اچھے لوگ، قد آور شخصیتیں جدید فکری تھیوری۔

پیش کرنے اور منوانے پر تلی تھیں، جیسے سرسید احمد خان۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا قاسم نانوتوی وغیرہم یہ وہ حضرات تھے جن سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں مگر یہ حفاظت کا بیڑہ کیا اٹھائے کہ خود ظلمت حالات میں فکر قدیم کے نشیمن کو فکر جدید کی بجلیاں کچھ اس انداز دلربائی سے نشانہ بنارہی تھیں کہ اگر امام احمد رضا اپنی فراست مومنانہ سے خطرات کو بھانپ کر آہنی دیوار نہ بن گئے ہوئے ہوتے اور پوری قوت سے اس کا دفاع نہ کیا ہوتا تو فکر قدیم کا نقشہ لوگوں نے بدل دیا ہوتا، مگر وہ امام احمد رضا تھے جو گنبد خضرا کی دہلیز تھام کر یہ مستانہ نعرہ لگا رہے تھے۔

یارسول اللہ!

تیرے غلاموں کا نقش قدم ہے راہِ خدا
وہ کیا بہک سے جو یہ سراغ لے کے چلے

امام احمد رضا کی فکر قدیم پر شدت کا اعتراف سب نے کیا، مولانا سید سلیمان ندوی اس دور کی فکری آویزش وآمیزش پر بحث کرتے ہوئے کہ کون کدھر تھا، اور کیا کر رہا تھا لکھتے ہیں۔

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی پرانی روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنہ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علما تھے۔ (حیات شبلی ص ۴۶)

اپنے اپنے حلقے میں کام کرنے والوں کو قوم نے بھی، اور اپنی منشا کے مطابق کام آنے والوں کو حکومت نے بھی ان کی خدمات کے صلے میں بھاری بھرکم القابات سے نوازا، کسی کو سر اور حامد خان، کسی کو شمس العلما کسی کو رئیس الاحرار، کسی کو حکیم الامت اور کسی کو امام الہند کے خطاب سے پکارا، مگر سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے فیضان کرم سے، اولیائے اُمت کے دیوانوں نے جس کو امام اہل سنت کہا وہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ہیں، میرا اپنا شعر ہے۔

قصر نجدی آج بھی لرزاں ہے جس کے نام سے
وہ امام اہل سنت آپ ہیں احمد رضا

فکر رضا کو صلابت پسندی کا وہ صلہ خدائے قادر وقدیر کی بارگاہ سے ملا کہ بعد والوں کی سلامت روی کا وہ مینار نور بن گیا۔ وہی خانقاہیں اپنی عظمت سابقہ کو بچا سکیں جو فکر رضا سے ہم آہنگ رہیں۔ وہی مساجد و مدارس اپنے مقاصد کے تحفظ میں کامیاب رہیں جن کی دستاویز میں 'مسلک اعلیٰ حضرت' کا طرہ سجایا گیا، وہی ادارے اپنی پہچان باقی رکھ سکے جس کے صدر دروازے کی پیشانی پر بریلوی مسلک کا طغرہ کندہ کر دیا گیا، اس وقت صورتحال یہ ہے کہ جو فرد جتنا زیادہ فکر رضا سے قریب ہے اس کا عقیدہ اتنا ہی محفوظ و مضبوط ہے۔

بلکہ جو محلّہ، جو گاؤں، یا جو شہر فکر رضا سے قریب ہے اس محلّہ، اس گاؤں اور اس شہر کا عقیدہ سلامت ہے، یہ حقائق بول رہے ہیں کہ فکر و اعتقاد کے مضبوط حفاظتی قلعہ کا نام مسلک رضا ہے، یہی وہ منفرد فکر ہے جس کا رشتہ اجمیر معلیٰ وایا بغداد مدینہ منورہ سے ملتا ہے۔ جس دور میں اعلیٰ حضرت نے فکر اسلامی کی حفاظت فرمائی ہے اس دور میں فکر اسلامی کو بچانا سب کے بس کی بات نہیں تھی یہ وہی کر سکتا تھا اکابرین جن کی پشت پناہی، معاصرین جن کی ہمت افزائی اور اصاغرین

جن کی ہمنوائی میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ قدم، قدم، مرحلہ بہ مرحلہ اور منزل بہ منزل ساتھ رہے ہوں، اکابر، معاصر، اصاغر جس انجمن میں ایک ساتھ جلوہ فرما نظر آئیں اس شمع انجمن کا نام امام احمد رضا ہے، سید الشہدا سرکار امام حسین رضی اللہ عنہ نے تیزی طوفان سے جس اسلام کو بچایا تھا فکر رضا نے اسی حسینی امانت کی حفاظت کی ہے اور قریب آیئے تو ہند کی بنجر زمین پر حضرت خواجہ غریب نواز نے معین الدین بن کر جس دین کا پودا اُگایا تھا، فکر رضا نے اپنے علم کی روشنائی سے اسی دین کی آبپاشی و آبیاری کی ہے۔ موجودہ تناظر میں قافلۂ حسینی کے قافلہ سالار کا نام امام احمد رضا ہے، کاروان غریب نواز کے محافظ دستہ کا نام امام احمد رضا ہے، تلوار اگر قلم کا روپ دھار کر حق و باطل کے درمیان امتیازی نشان کھینچنے لگے تو سمجھ جایئے فیضان امام حسین کلکِ رضا بن کر اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے اور تصوف اگر تفقہ کا قبا زیب تن کر کے کردار و گفتار کی مردہ زمین پر فکر نو بہار کی حنابندی کرنے لگے تو سمجھ جایئے غریب نواز کا فیض فتاویٰ رضویہ بن کر اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ امام احمد رضا کی فکر صدیقی جمال، فارقی عدل، عثمانی نور، علوی جوہر، حسینی جذبہ، نعمانی اخلاص، جیلانی ایثار، قادری رنگ اور چشتی آہنگ کے حسین مجموعہ کا نام ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی فکر میں پیار کی خوشبو ہے، محبت کی لطافت ہے، اخلاق کی نغمگی ہے، اتحاد کی آواز ہے، بھائی چارگی کا پیغام ہے، فلاح ملت کی ضمانت ہے، اور زندگی جاوداں کی مکمل دستاویز ہے، اسی لیے ان کی روح کا آوازہ تھا۔

اللہ کی سرتابقدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے میری جان ہیں یہ

ان کا کہنا تھا

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

ان کا ماننا تھا

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے
کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

ان کا اذعان تھا

انہیں جانا انہیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
للہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا

ان کا ایقان تھا

اہل سنت کا ہے بیڑہ پار اصحاب حضور
نجم ہیں، اور ناؤ ہے عترت رسول اللہ کی

ان کا پیغام تھا

خاک ہو کر عشق میں آرام سے سونا ملا
جان کی اکسیر ہے الفت رسول اللہ کی

آج امام احمد رضا کے فکری نغموں کا الاپنے، جواہر پاروں کو سینے سے لگانے کی بے حد ضرورت ہے، آج نفرتوں کی آگ نے پورے معاشرے کو جھلسا کر رکھ دیا ہے۔ بغض وحسد اور کینہ وکپٹ نے دل کے گلشن کو اجاڑ پھینکا ہے۔ عداوت وبغاوت نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے۔ پیشانی پر اضطراب کی شکن نظر آتی ہے۔ آنکھوں میں حقارت کی چنگاری دکھائی دے رہی ہے۔ انسانی جود افتراق کا انگارہ بنا ہاہے۔ ایسے بھیانک ماحول میں میرا دعویٰ ہے کہ صرف اور صرف امام احمد رضا کی فکر ہے جو وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ یہ صرف فکر رضا ہے جو ٹولیوں، ٹکڑیوں میں بٹی مت کو محبت رسول کے لطیف دھاگے میں پرونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی فکری مضراب پر چوٹ پڑے گی، تو درد بھرے نالے ابھریں گے۔ اسی ساز کو چھیڑا جائے گا، تو پیار کا ترانہ ابلے گا۔ اسی بربط کو گدگدایا جائے گا، تو نغمہ وحدت کا سوتا پھوٹے گا۔ اسی پیکر ناز کو دل کی مخملی مسند پر بٹھایا جائے گا، تو جلوہ جاناں کے نور

وسرور سے دنیا سرشار و شرابور ہوگی، اسے مت بھولیے کہ اس ڈیڑھ سو سال کے اندر اعتقادی، علمی، عملی اور فکری سطح پر جس ہستی کا فیضان سب سے زیادہ بٹا اور ہنوز بٹ رہا ہے سچی بات یہی ہے کہ وہ ہستی امام احمد رضا کی ہے، بنام اسلام وسنیت آج جتنے چراغ جل رہے ہیں ہر چراغ میں تیل امام احمد رضا کا ہے، امام احمد رضا چوں کہ مفکر اعظم عالم اسلام تھے، اس لیے ان کی فکر کا دائرہ صرف شریعت تک محدود نہیں، بلکہ سماج کی ہر ضرورت کو محیط ہے، انہوں نے صرف کامل الایمان مسلمان بننے اور باعمل زندگی گزارنے ہی کی تلقین نہیں فرمائی بلکہ ایک مسلمان اپنے سماج میں باوقار زندگی کیسے گزار سکتا ہے۔ مسلم معاشرے میں خوشحالی کا چشمہ کیسے پھوٹ سکتا ہے اور مسلمان خوشحالی کے دھارے سے کیسے جڑ سکتا ہے۔ تمام امور پر معرکۃ الآرا بحث فرمائی ہے اور تحقیقات کے نگینے پیش فرمائے ہیں، فروغ اہل سنت کے لیے ان کا دس نکاتی پروگرام آج خوب چھاپا جارہا ہے، مگر صرف چھاپا جارہا ہے، اگر یہ کسی دوسرے مکتبِ فکر میں ہوتا تو اسے بروئے کار لاکر، عمل کر کے اور کروا کے اپنے فکری نہج کا تاج محل تیار کرلیا گیا ہوتا مگر یہ ہماری انتہائی غفلت ہے کہ

سب باندھ چکے کب کے سر شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستان کی ہوا دیکھ رہے ہیں

روزی روزگار کا مسئلہ آج کا بڑا پیچیدہ اور بحث آرا مسئلہ ہے، اس کی اہمیت ہی کے پیش نظر باضابطہ طور پر اس نظریہ کو کالج ویونیورسٹی میں شامل نصاب کیا گیا ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جدید معاشی نظریہ سب سے پہلے امام احمد رضا نے پیش کیا ہے، مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور معاشی بدتری کو دور کرنے کے لیے آپ نے 'رسالہ تدبیر فلاح ونجات واصلاح' تحریر فرمایا جو ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا، اپنے اس رسالہ میں مسلمانوں کو مرفہ الحال خوش حال بنانے کے لیے آپ نے چار نکات پیش کیے ہیں۔

۱ ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں، تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں، پس انداز ہوسکیں۔

۲ ممبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس اور حیدرآباد کے تونگر مسلمان بینک کھولیں۔

۳ مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں
۴ علم دین کی ترویج واشاعت کریں۔

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی، کینیڈا نے امام احمد رضا کے ان معاشی نکات پر مبنی بڑا وقیع وبسیط، قابل مطالعہ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں۔

'۱۹۱۲ء میں جب کہ نکات شائع ہوئے برصغیر میں عالم اقتصادیات، کا مطالعہ عام نہیں تھا، ۱۹۳۶ء میں ایک انگریز ماہر اقتصادیات، ڈاکٹر جے ایم کینز نے اپنا مشہور زمانہ، "نظریۂ روزگار وآمدنی' پیش کیا، کینز کو ان کی خدمات کے صلے میں تاج برطانیہ نے لارڈ کے خطاب سے نوازا، جدید اقتصادی نظریات کی ابتدا ۱۹۳۰ کے بعد سے ہوئی، یہ بات کس قدر حیرت انگریز ہے کہ نگاہ مرد مومن نے ان جدید تقاضوں کی جھلک ۱۹۱۲ء ہی میں دکھادی تھی۔ (علم، عمل، عشق اور امام احمد رضا ص ۸۰)

۱۹۳۶ء میں جدید معاشی نظریہ پیش کرنے والے کو'لارڈ' جیسے خطاب سے اگر نوازا جاسکتا ہے تو پھر وہ شخصیت کتنے عظیم خطاب کی مستحق ہوگی جس نے ۲۴ برس پہلے ۱۹۱۲ ہی میں جدید معاشی نظریہ پیش کردیا تھا، یہ زندہ قوم کی زندہ علامت ہے کہ کارنامہ گر شخصیت کی ملکی سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے، برا ہو متعصبانہ ذہنیت کا جس نے قوم مسلم کی سوچ وفکر کے سرچشمہ ہی کو منجمد کررکھا ہے، دل میں اعتراف حقیقت کا جذبہ موجود ہوتے ہوئے بھی زبان اظہار بیان سے قاصر نظر آتی ہے، جس کا خمیازہ یہ ہے کہ پیاری عالمی شخصیتوں کا آفاقی پیغام بھی ارتعاشی لہروں کی نذر ہوجاتا ہے اور دنیا سمجھتی ہے کہ ہم میں کوئی عبقری نہیں ہے، وقت آگیا ہے کہ اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لیے فکری تنگناؤں کے حصار سے نکل کر امام احمد رضا جیسی جینیس شخصیت کو عالمی اسٹیج پر پیش کیا جائے، اور فخریہ پیش کیا جائے۔ اس مفکر کی عبقریت کا کیا کہنا مولانا ابوالکلام آزاد جیسا قادر الکلام شخص جس کے الفاظ اپنے تقابلی مطالعہ کے ایک مضمون کی تمہید میں بطور مستعار لیے ہوں، (پیغام رضا امام احمد رضا نمبر ۲۴۳)

اس مفکر کی جامعیت کا کیا پوچھنا مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے اپنے حلقے میں فقیہ النفس شخص نے، جس کے فتاویٰ سے کئی مسئلوں کو اپنے فتاویٰ میں من وعن نقل کیا ہو (معارف رضا شمارہ ۱۹۹۱ء)

یہ فکر رضا کا آفتاب ہے جس سے علم کا شیش محلہ بھی روشن ہے اور فکر کا لال قلعہ بھی، اعلیٰ حضرت کی فکر زرخیز نے قوم وملت کا دامن ہر قسم کے گل ولالہ سے ایسا سجا دیا ہے کہ کسی بھی حالت میں کبھی بھی ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، آج ضرورت ہے امام احمد رضا کی ہر فکر کی تشہیر کی خاص طور پر نظریۂ روزگار اور آمدنی کو زیادہ سے زیادہ اچھالنے کی اس لیے کہ یہ وہ نظریہ ہے جس نے اولیت کا سہرا امام احمد رضا کے سر سجایا ہے، اگر آج بھی ان چاروں معاشی نکات کو نافذ العلم کر دیا جائے اور فرد سے لے کر جماعت تک سب اس کے پابند ہو جائیں تو پھر خوشحالی کا وہ دور دورہ ہوگا کہ دنیا رشک کرے گی اور وہ سبز انقلاب رونما ہوگا کہ لوگ سارے انقلاب بھول جائیں گے۔ یہ فکر رضا کی مقناطیسیت ہے کہ جو بھی قریب آتا ہے اس کی کشش میں گم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر امجد رضا امجد
القلم فاؤنڈیشن، پٹنہ

اردو کے عناصر خمسہ اور امام احمد رضا

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

پچھلے دنوں ایک نجی محفل میں ایک بزرگ نقاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے''۔ اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدہ کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے''۔

مضمون کے اختتام پر لکھا ہے:

> '' اگر نقاد اپنے کسی عقیدے کے تحت ادب کو پرکھنے کی کوشش کرے اور ہر اس ادب پارے کو گردن زدنی قرار دیدے۔ جو اس کے عقیدے کے مطابق نہیں، پھر ادب کا خدا ہی حافظ ہے''۔

بدقسمتی سے ہمارے مؤرخین وناقدین بھی اردو ادب کی تاریخ مرتب کرتے وقت عصبیت کا شکار ہو گئے اور انہوں نے عقیدے کی عینک لگا کر اردو ادب کی تاریخ لکھی۔ اس سنگین جرم سے جہاں تحقیق وتنقید اور تاریخ نویسی کا دامن مجروح ہوا وہیں ہماری ادبی تاریخ بھی مشکوک ہوگئی۔ نتیجۃً تحقیقی اصول وضوابط کی روشنی میں اب نئے سرے سے اردو کی ادبی تاریخ پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فن کوئی بھی ہو اس کے مقتضیات کی پاسداری ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو فنکار کا وہ تخلیقی عمل گردن زدنی ہوگا۔۔۔ تاریخ نویسی بھی ایک فن ہے، جو انصاف ودیانت کا متقاضی ہے اور یہ تقاضا اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب مؤرخ کے سامنے اس کے مخالف وحریف کی شخصیت ہوتی ہے اور اسے نفس کے ابھرتے جذبات کو دبا کر فنی اور اخلاقی قدروں کو بحال کرنا ہوتا ہے۔

اس محسوس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا اہم حصہ ہے۔ انہوں نے مذہب کی تبلیغ، مسلک کی ترویج اور مریدین کی تربیت کے لیے اردو کو وسیلہ بنایا

تھا۔اس طرح ضمنی طور پر اس زبان کو تقویت ملی اور اسے پھلنے، پھولنے، پنپنے کے خوب خوب مواقع میسر آئے۔ڈاکٹر عبدالحق کے بقول:

''یہ بزرگ اس زبان کے ادیب وشاعر نہ تھے یا کم ازکم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھا نہ اس کا انہیں کچھ خیال تھا۔ان کی غایت ہدایت تھی لیکن ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا، اور عہد بہ عہد نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہوگئی''۔

گویا ابتدا سے ۱۸۰۰ء تک اردو کے فروغ میں خالص مذہبی ادب کارفرما رہا۔۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی جس سے اس زبان کے استحکام کے لیے خوشگوار فضا میسر آئی۔کالج سے باہر بھی نثری ادب عہد بہ عہد نئے منازل طے کرتا رہا۔اس سلسلے میں دہلی کالج اور نثر غالب کے گہرے نقوش آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ان سہ طرفہ مساعی کا حاصل یہ ہوا کہ ۱۸۲۵ء میں اردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دے دی گئی۔

جدوجہد کا یہ عمل برابر جاری رہا، اضافے اور تراشے ہوتے رہے۔زبان کی ہیئت بدلتی رہی مگر مذہب سے اس کا علاقہ کبھی منقطع نہیں ہوا اور بالآخر انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ نومولود اور ارتقاپذیر زبان جدید نثری ادب کے قالب میں ڈھل گئی ــــــ

آج زبان اردو اپنے شباب پر ہے اور دنیا کی کسی بھی زبان کے پہلو میں کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، مگر یہ قابل ذکر بات ہے کہ جس بنیاد پر اس زبان اردو کی یہ دلکش عمارت کھڑی ہے وہ مذہب ہے۔مذہب سے وابستگی نے اسے کمیت وکیفیت ہر دو اعتبار سے قابل اعتبار بنایا ہے اور اپنی بقا کے لیے آج بھی یہ زبان مذہب کی مرہون منت ہے۔اگر عہد قدیم سے لے کر آج تک اردو شعر ونثر کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا جائے تو بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان کے فروغ وارتقا میں ۸۰/ فیصد حصہ مذہب کا ہے۔اگر مذہبی سرمائے کو اس زبان سے الگ کردیا جائے تو یقیناً شدید خلا کا احساس ہوگا۔اس تعلق سے اگر اردو عناصر خمسہ سرسید، حالی، شبلی ،نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور سرسید کے دیگر رفقا میں محسن الملک وقار الملک اور چراغ علی وغیرہ کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بدیہی طور پر سامنے آئے گی کہ ان کی خدمات کا غالب حصہ مذہبیات ہی کے حوالے سے ہے۔یہاں ان تمام اشخاص کا تفصیلی تذکرہ تو ممکن نہیں ہے اس لیے چند مخصوص حضرات کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر ڈالی جارہی ہے

عناصر خمسہ میں سرسید کا نام سب سے نمایاں ہے، مولانا حالی نے ان کی تصنیفی زندگی کے تین ادوار مقرر کیے ہیں:

پہلا دور ـــــ شروع سے ۱۸۵۷ء تک

دوسرا دور ـــــ ۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان ۱۸۶۹ء تک

تیسرا دور ـــــ سفر انگلستان سے وفات ۱۸۹۸ء تک

ان تینوں ادوار میں لکھی گئی کتابوں کی تعداد کم وبیش تیس ہیں جن میں

پہلے دور کی تصانیف:

۱- جلاء القلوب بذکر المحبوب : سیرت رسول عربی پر مختصر رسالہ جو مجالس میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھا۔

۲- تحفہ حسن : تحفہ اثنا عشریہ کے باب ۱۰، ۱۲، کا اردو ترجمہ جس میں شیعہ کے بعض اعتراض کا جواب ہے۔

۳- قول متین در ابطال حرکت زمین : نظریہ سائنس کے خلاف گردش زمین کی رد میں۔

۴- کلمۃ الحق : پیری مریدی کے مروجہ طریقے کے خلاف۔

۵- راہ سنت و بدعت : اس میں اہل تقلید کے مروجہ عقائد ورسوم کی مخالفت کی گئی ہے اس میں وہابی اثرات غالب ہیں۔

۶- نمیقہ : مسئلہ تصور شیخ کی حمایت اور اس پر دلائل۔

۷- کیمیائے سعادت: امام غزالی کی کتاب کے چند اوراق کا ترجمہ۔

دوسرے دور کی مذہبی تصانیف:

۸- تحقیق لفظ نصاریٰ : مسلمانوں کے تئیں انگریزوں کے ذہن میں پیدا شدہ چند غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے۔

۹- تبیین کلام :اس میں انجیل اور قرآن کی اصولی وحدت ثابت کی گئی ہے۔

۱۰- رسالہ احکام طعام اہل کتاب : اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں۔

تیسرے دور کی مذہبی تصانیف:

۱۱- خطبات احمدیہ : اس کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات کو ہر عیب سے مبرا

ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کے اعتراضات کا جواب ہے اس میں تحقیق و جستجو اپنے معیار پر ہے۔

۱۲- تفسیر القرآن: خصوصیت سے قابل ذکر ہے یہ تفسیر سرسید کی آخری تصنیف ہے، اس تفسیر سے متعلق اک خاص بات ڈاکٹر سید عبداللہ کے حوالے سے یہاں قابل ذکر معلوم ہو رہی ہے وہ اپنی تصنیف 'سید احمد خاں اور ان کے رفقا کی خدمات کا علمی جائزہ' میں لکھتے ہیں:

''سرسید کی دوسری تصانیف کی طرح یہ تفسیر بھی مقبول نہ ہو سکی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تصنیف نے آگے چل کر تحریک مطالعہ قرآن اور عام افکار دینی پر بڑا اثر ڈالا۔ مجموعی لحاظ سے سرسید کے نام سے کوئی جماعت یا کوئی فرقہ منسوب نہیں مگر ان کا دینی نظریہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف اسلامی فرقوں کا جز بن گیا ہے.... چنانچہ اس کے گہرے اثرات بیان القرآن، (مولانا محمد علی جماعت احمدیہ، لاہور) بیان القرآن (مولانا احمد بن اُمت مسلمہ) تذکرہ (عنایت اللہ مشرقی) تفسیر ایوبی (حکیم احمد شجاع) یہاں تک کہ ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد) میں نمایاں طور پر موجود ہیں''۔

سرسید کے دیگر رفقا کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی ادبی و علمی خدمات کا بھی رشتہ مذہب سے جڑا ہوا ہے ـــــ ڈپٹی نذیر احمد جو اردو ادب کے عناصر خمسہ کا جز ہیں ان کی کئی کتابیں مذہبی ادب کی ترجمان ہیں وہ خود بھی مذہبی تھے۔ مسجد کے مکتب سے تعلیم شروع کی پھر دینی مدارس کا رخ کیا اور آخر میں دلی کالج پہنچے، آزادیٔ فکر اور سرکار پرستی کا سبق دہلی کالج ہی کی دین تھا ـــــ افکار کی بنیاد مذہبی ہونے کے باوجود وہ نئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جدید تعلیم کا نشہ کچھ ایسا چڑھا کہ وہ مذہب کے اصولوں کو بھی سائنس کا پابند بنانے لگے۔ پھر دائرہ مذہب میں رہ کر دہریت کی اوٹ میں تانکنے جھانکنے کا عمل ان کی مغرب زدہ فکر کا جز بن گیا۔

مگر ان کا ضمیر چوں کہ مذہب سے اٹھا تھا اس لیے دینی جذبہ کی کمی کے باوجود وہ مذہبی اظہار خیال پر موقع بے موقع مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''نذیر احمد کے ناولوں میں یہ کمی پائی جاتی ہے کہ وہ بیچ بیچ میں مذہب اور اخلاق پر تقریر کرنے لگتے ہیں''۔

ان کے قابلِ ذکر دینی تصانیف میں ترجمۃ القرآن اور ان کی مشہور فقہی کتاب الحقوق والفرائض ہیں۔ مگر دونوں کتابوں کا علمی اور ادبی معیار ان کے علمی معیار سے بہت نیچے ہے۔ سرسید کے دور میں زبان کی ہیئت نے جو کروٹ لی تھی اور اس پر جدیدیت کا جو رنگ چڑھ رہا تھا الحقوق والفرائض کی زبان اور طرزِ استدلال اس سے بہت مختلف ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا طرزِ استدلال جدید نہیں اس کا رنگ شاہ ولی اللہ صاحب اور دیگر مسلم علما کی تصانیف سے ملتا جلتا ہے اور ان کا عام طریق بحث اور نقطۂ نظر قدیم ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب اور تصنیف بھی عام پسند نہیں اور افسوس یہ ہے کہ اس کو دلچسپ بنانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی“۔

اور غالباً اسی وجہ سے کئی نقادوں نے ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ”وہ جتنے بڑے عالم تھے اس کے مطابق انہوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی اور ناول نگاری ان کی عظمت کے خلاف تھی“۔

الحقوق والفرائض کی ادبیت کے معیار و اقدار کے دیکھنے کے بعد ان کے ترجمۂ قرآن کو لیجئے —— اپنے اس ترجمہ کے بامحاورہ ہونے پر انہیں بڑا ناز ہے اور ان کے مداحین کا ایک طبقہ بھی اسے بامحاورہ اور مثالی کہتا ہے مگر دانشور حضرات کے نزدیک یہ ترجمہ سوقیانہ محاورات پر مشتمل ہے۔ اس تعلق سے ایک دانشور کا تنقیدی نوٹ ملاحظہ کیجیے:

”معلوم نہیں کہ ڈپٹی صاحب محاورہ کا معنی کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان کے ترجمہ کے ملاحظہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت محاورہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک آیت کے مطلب کو ایک ہندوستانی مثل میں ادا کر دی یا کسی تمثیل کو کسی مثال سے بھڑا دیں۔ گو قرآن کا مفہوم لفظی اس سے ادا ہو یا نہ ہو اور متن کی تمامی قوت اس میں آئے یا نہ آئے“۔

مولوی نذیر احمد کی دونوں کتاب کے تجزیہ کے بعد شبلی نعمانی صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیجئے، جن کا شمار اردو کے بڑے مصنفوں میں ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرت و رنگینی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تصانیف میں فلسفہ، ادب، تاریخ، سوانحی مضامین و مکاتیب وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں مگر جن تصانیف سے وہ زندہ ہیں وہ المامون، الفاروق، سیرت النبی، علم الکلام، شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ تاریخی ہوتے ہوئے بھی بعض کتابیں مذہبی ہیں اس لیے دیانتہً ان کو مذہبی ادب کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

سر سید کے عزیز ترین دوستوں میں محسن الملک سید مہدی علی اور چراغ علی دہلوی بھی تھے یہ دونوں حضرات بھی سرسید کے دینی نظریات کے مبلغ تھے۔نواب محسن الملک کی تصانیف میں تقلید عمل بالحدیث ، مسلمانوں کی تہذیب، آیات بینات کا تعلق مذہب سے جڑا ہے مگر ان کی تصانیف کا علمی اور ادبی معیار کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ سے سنئے :

''محسن الملک کی کتابیں بہت بلند درجے کی نہیں اور مضامین میں بھی کوئی جدید خیال موجود نہیں۔البتہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بڑا زور اور جوش ہے''۔

مولوی چراغ علی نے تعلیقات ، اسلام کی دنیوی برکتیں ، بی بی ہاجرہ ، ماریہ قبطیہ، تعلیق نیاز نامہ وغیرہ کتابیں لکھیں۔ان کی کتابیں تاریخی ہوتے ہوئے بھی مذہبی ہیں۔لہٰذا ہم انہیں مذہبی ادب سے الگ نہیں کر سکتے ----ان کی دینی بصیرت کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی جان لینا بس ہے کہ ان کو سرسید کے دینی افکار ونظریات سے جو اتفاق رائے تھا اور کسی کو نہ تھا، چنانچہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''اگر نیچری کے لفظ کا اطلاق سرسید پر ہو سکتا ہو تو ہم مولوی چراغ علی کو ان سے کم نیچری نہیں کہہ سکتے''۔

انہوں نے اپنی ایک انگریزی کتاب میں لکھا ہے: (ترجمہ)

''اسلام ہر زمانے کی معاشرت کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے''۔

ان کا خیال ہے کہ حدیث کی عقیدتاً ضرورت نہیں، اسلامی سول لاء کے بعض حصے از سر نو لکھے جانے چاہئیں، اسلام میں رائے کی آزادی ہے۔غلامی، جنگ و جدل اور جہاد کا اسلام میں کوئی ذکر نہیں۔

اس اجمالی بحث سے اس دور کے مذہبی ماحول اور مذہبی ادب پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اب یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو کی پیدائش، نشو و نما اور ارتقا میں مذہبیت کا گہرا عمل دخل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جدید نثری ادب تک، کسی نہ کسی طرح اردو سے وابستہ رہا۔بعد کے عہد بہ عہد ارتقائی مراحل نے رفتہ رفتہ مذہب سے اس کا رشتہ کمزور کر دیا اور اس کی جگہ ناول، افسانہ، ڈرامہ اور طنز و مزاح نے لے لی اور رفتہ رفتہ یہ طرز فکر اردو ادب پر غالب آگیا اور مذہبی ادب کا تصور ماند پڑ گیا۔اس طرز فکر سے مذہبی ادب کو جو نقصان پہنچا وہ گہرے صدمے کا باعث ہے مگر اس کے باوجود جب کوئی مورخ اردو کے عناصر خمسہ یا اور دوسرے متعلقین کی تاریخ لکھتا ہے تو کسی نہ کسی طرح مذہبی ادب کا ذکر نا گزیر ہو جاتا ہے اس تعلق سے وہ ہستیاں جن سے اردو کو جلا ملی، مگر تاریخ میں انہیں کوئی جگہ نہیں دی گئی، مظلوم نظر آنے لگتی ہیں۔

عناصر خمسہ کے اسی ہنگامی اور بحرانی دور میں ایک علمی اور ادبی شخصیت ایسی بھی تھی جن کے علم وفضل اور گرانقدر علمی، ادبی جواہر پارے سے دنیا مستفیض ہورہی تھی۔ جنہیں بیک وقت ۵۵ علوم وفنون پر کامل دستگاہ اور ید طولیٰ حاصل تھا۔

جنہوں نے ۱۲ ربلکہ جدید ترتیب کے مطابق ۳۰ رجلدوں میں ''فتاویٰ رضویہ'' لکھ کر فقہیات کے حوالے سے زبان اردو کو ذخیرہ الفاظ تراکیب اور تحقیقی وتنقیدی مباحث سے مالا مال کیا۔

جنہوں نے ''حجب العوار'' لکھ کر پہلی بار اردو دنیا کو اصول تحقیق سے آشنا کیا۔

جنہوں نے ''الزمزمۃ القمریہ'' لکھ کر اردو میں اصول تنقید کی بنیاد رکھی۔

جنہوں نے ''فوز مبین'' لکھ کر اردو کو سائنس سے اور سائنس کو اردو سے متعارف کرایا اور حرکت زمین کے تعلق سے نیوٹن، آئین اسٹائین، کیپلے، کوپرنیکس، گیلے لیو اور ویمقراطیس کے نظریات کا ۱۰۵ ردلائل سے رد فرمایا۔

جنہوں نے الکلمۃ الملھمہ اور مقامع الحدید لکھ کر قدیم وجدید فلسفہ کے حقائق سے اردو دنیا کو آگاہ فرمایا

جنہوں نے 'الزلال الانقی' لکھ کر تاریخ نویسی کے فن میں اپنی خداداد صلاحیت ومہارت کا اشارہ دیا

جنہوں نے 'سید المرسلین' لکھ کر اردو میں سیرت مصطفیٰ کے جلوے بکھیرے۔

جنہوں نے شعری مجموعہ ''حدائق بخشش'' کے ذریعہ اردو ادب کو نعت وغزل کی ہم آہنگی کے نادر نمونے دیے اور اس کے خزانہ ادب کو مالا مال کر دیا۔

جنہوں نے '' قصیدہ نوریہ، قصیدۂ معراجیہ، قصیدہ سلامیہ، قصیدہ درودیہ، قصیدہ حضرت عائشہ، اور قصیدہ چراغ انس لکھ کر اردو قصیدہ نگاری کو قابل افتخار بنایا، اور جنہوں نے ترجمہ قرآن کنزالایمان لکھ کر بیک وقت نذیر احمد کے محاوراتی، ابوالکلام آزاد کے علمی اور مودودی کی آسان نثر کا سحر توڑ دیا۔ غرض جس نابغۂ روزگار شخصیت نے اردو کے حوالے سے جملہ علوم وفنون کو اور علوم وفنون کے حوالے سے اردو زبان کی بلاشریک وسہیم تنہا ناقابل فراموش خدمت انجام دی، اسے حاملان ادب نے کشتہ تاریخ بنا کر چھوڑ دیا۔ میں تفصیل سے گریز کرتے ہوئے یہاں صرف ایک مورخ ''شیخ اکرام '' کی تاریخی کتاب ''موج کوثر'' کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

شیخ محمد اکرام نے موج کوثر میں ایک جگہ لکھا ہے:

"جس دور میں مولانا سید احمد، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا محمد قاسم دیوبندی، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی اور اقبال سرگرم کار رہے ہوں اسے مذہبی خشک سالی کا زمانہ کیسے کہا جا سکتا ہے"۔

انہوں نے ۱۸۵۷ء سے تقسیم ہند تک کے تمام افراد کا تعارف اور ان کے کارنامے پیش کیے۔ مگر امام احمد رضا کو فراموش کر دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خشک سالی اس وقت تک دور ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ اقبال کے اس ممدوح کا ذکر نہ کیا جائے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ان کا یہ اعتراف

"دیوبند سے فیض یافتہ مولانا انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام مولانا شبیر عثمانی اس لائق ہیں کہ ان کے کارنامے علیٰحدہ عنوانات کے تحت بیان ہوں۔ انشاء اللہ یہ کمی آئندہ اشاعت میں پوری کی جائے گی"۔

پڑھ کر حسن اعتماد کا وہ طلسم بکھر جاتا ہے جو فطری طور پر الکوثر سیریز سے قائم ہوتا ہے وہ سارے افراد جو فکر و اعتقاد کے حوالے سے ان کے اپنے تھے وہ ذکر کیے گئے مگر امام احمد رضا کے ذکر سے اغماض کیا گیا۔ گویا ان کی نظر میں امام رضا کی علمی ادبی فکری سائنسی خدمات کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ شیخ محمد اکرام کی تاریخی معلومات پر شبہ نہیں کیا جا سکتا مگر امام رضا کے تعلق سے ان کے اس فکری رجحان اور دانستہ جرم پر حرف گیری تو کی ہی جا سکتی ہے۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں سے بیسویں صدی کی دو دہائیوں تک علمی، فکری، شرعی، تنقیدی اور سائنسی شعبے پر امام احمد رضا چھائے رہے۔ انہوں نے سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری وغیرہم پر اعتقادی شرعی اور سیاسی تنقیدیں کیں۔ یہ تنقیدیں خالص علمی ہیں جس کی اہمیت ادب اور تاریخ دونوں حیثیت سے مسلم ہے۔ فکری اور شرعی نقطہ نظر سے اس عہد کو امام رضا سے موسوم کیا جانا چاہیے ——— ہزار سے متجاوز ان کی تصانیف اس محسوس حقیقت کی ترجمان ہیں۔ مگر شیخ محمد اکرام صاحب کو یہ شواہد نظر نہیں آئے۔ موج کوثر میں اہل حدیث عنوان کے تحت ایک ذیلی سرخی "بریلوی پارٹی" قائم کر کے انہوں نے اپنے جس نظریہ کی ترجمانی کی ہے وہ ایک مورخ اور ادیب کے قطعاً منافی ہے ورنہ دنیا جانتی ہے کہ آج تک ہندوستان میں "بریلی پارٹی" کے نام سے کوئی فرقہ یا کوئی تحریک پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ہاں اہل سنت و جماعت کو عرفاً بریلوی کہا جاتا ہے۔ (اور یہ نام بھی ان کے مخالفین کا دیا ہوا ہے) شیخ محمد اکرام صاحب اسی ذیلی سرخی کے تحت لکھتے ہیں:

صوبہ جات متحدہ کی جس بستی رائے بریلی میں مولانا سید احمد بریلوی پردہ عدم سے ظہور میں آئے اس کی ایک ہمنام بستی بانس بریلی ۱۲۷۲ھ میں ایک عالم پیدا ہوئے۔ مولوی احمد رضا خاں کا نام، انہوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں مختلف نزاعی اور علمی مباحث پر لکھیں"۔

آج تک کسی کتاب میں امام احمد رضا کی تصانیف کی تعداد پچاس نہیں بتائی گئیں۔ مگر شیخ صاحب کو وہ بات بھی نظر آ گئی جس کا کہیں ذکر نہیں۔ ۱۸۸۷ء میں جب کہ آپ کی عمر اس وقت صرف ۳۰ برس کی تھی مولانا احسان علی کی کتاب "تذکرہ علماء ہند" طبع ہوئی اس میں تصانیف کی تعداد ۷۵ بتائی گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"تصانیف وے تا ایں زماں ہفتاد و پنج مجلّہ رسیدہ"

تا ایں زماں کی قید سے ظاہر ہے کہ یہ صرف ۱۸۸۷ء تک کی تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں خود امام رضا نے اپنی تصانیف کی تعداد دو سو سے زائد بتائی۔ "صنف کتبا تزید علیٰ مائتین"
۱۹۰۹ء میں امام رضا کے قول تزید علیٰ مائتین پر تحقیق کے بعد مولانا ظفر الدین بہاری عظیم آبادی نے امام احمد رضا کی تصانیف کی تعداد ۳۵۰ تک پہنچائی مگر اس اعتراف کے ساتھ۔

"میں نہیں کہتا کہ سب اسی قدر ہیں بلکہ یہ صرف وہ ہیں جو اس وقت کے استقرا میں میرے پیش نظر ہیں"۔

اور آج کی تحقیق کے مطابق یہ تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ مولانا محمد اعجاز ولی خاں، نئی تحقیق کی بنیاد پر لکھتے ہیں:

"صاحب التصانیف العالیہ و التالیفات الباھرہ التی بلغت اعداد ھا فوق الالف"۔

اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ شیخ محمد اکرام صاحب نے تاریخی مواد حاصل کرنے کے لیے کتابوں کو نہیں عقیدے کو رہنما بنایا ہے اور ہر اس شخصیت و ادب پارے کو گردن زدنی قرار دیا ہے جو ان کے عقیدے کے محاذی تھا۔ اس طرح سر ابھارتے اس نظریہ کو جواز کا پہلو مل رہا ہے کہ جب نظریاتی اختلاف تاریخی حقائق سے چشم پوشی کا سبب بن سکتا ہے تو طبقاتی اور ذاتی مخالفت نے کیا کیا کچھ کرشمہ سازیاں کی ہوں گی، اور اگر ایسا ہے تو الکوثر سیریز کی کیا تحقیقی حیثیت رہ جاتی ہے اور اس پر اعتماد و استدلال کہاں تک درست ہوگا۔

بہر حال اس دور کے ادبی تحقیقی اور تنقیدی ماحول میں امام رضا آفتاب نیم روز کی طرح چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رسائل سے لے کر ہزاروں اور سیکڑوں صفحات میں پھیلی ہوئی کتابوں تک وہ تمام ادبی محاسن جو عناصر خمسہ کے یہاں علی الانفراد پائے جاتے ہیں وہ امام رضا کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اور اردو کی نثری خدمت، مجموعی طور پر جتنی عناصر خمسہ نے کی، اس سے کہیں زیادہ تنہا امام رضا نے کی۔ ان کی دینی تصانیف میں ندرت بیان، شوکت الفاظ جملوں کی برجستگی وشگفتگی اور جوشش پیام وشیرینی کلام اپنے جوبن پر نظر آتی ہے مگر:

ع: آنکھ والا ترے جوبن کا تماشہ دیکھے

ادب کسی عقیدے کا پابند نہیں، وہ زبان کی روح ہوتا ہے۔ ہم اسے اپنے نظریات کے تابع نہیں کر سکتے اور جو ایسا کرتے ہیں ان کا سرمایہ ادب خود ہی گردن زدنی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

ادب کی تخلیق کے سلسلہ میں اس بات کی قطعاً کوئی قید نہیں کہ اس میں ادیب نے کس عقیدے کا اظہار کیا ہے یا سرے سے کسی عقیدے کو پیش بھی کیا ہے یا نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کے یہاں تخلیقی عمل توانا ہے نیز وہ اظہار وابلاغ پر بھی قادر ہے تو لا محالہ اس کی تخلیق ادب کے زمرے میں شامل ہوگی، چاہے اس نے کیسے ہی تاثر یا عقائد کا اظہار کیوں نہ کیا ہو یہ ادب کی پہلی شرط ہے"۔

☆☆☆

اضافات

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی

کوئنز یونیورسٹی، کینیڈا

چیئرمین بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن

حیدرآباد، پاکستان

امام احمد رضا کے معاشی نکات

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے مولانا احمد رضا خان بریلوی پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ اپنی تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب کے دوررس نگاہیں مولانا احمد رضا خان کے ان نکات کی طرف مرتکز ہوگئیں، جوانہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے اپنے رسالے ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' میں تحریر فرمائے اور جو ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ میں کلکتہ سے شائع ہوئے۔ ان نکات کی تفصیل یہ ہے۔

۱ ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے۔ مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں پس انداز ہوسکیں۔

۲ بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بینک کھولیں۔

۳ مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔

۴ علم دین کی ترویج واشاعت کریں۔

یہ چار نکات بظاہر بے حد مختصر ہیں لیکن ان میں معانی کا جو ذخیرہ پوشیدہ ہے، اس کے اظہار کے لیے ڈاکٹر صاحب نے مجھے منتخب فرمایا ہے کہ میں بحیثیت معاشیات کے طالب علم ان نکات کی وضاحت کروں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اگرچہ گزشتہ بیس سال سے معاشیات پر درس دے رہا ہوں، لیکن اس کے

باوجود میں سمجھتا ہوں کہ میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنے احساسات کو قلمبند کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے پھر بھی میں نے ارادہ کیا ہے کہ ان نکات کی وضاحت کرنے کی پوری پوری کوشش کروں۔

علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

بلاشبہ مومن کے اشارے میں اور مومن بھی کیسا مومن کہ جس کی ہر سانس عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معطر تھی۔ ان اشاروں میں جہان معنی پوشیدہ ہے، اس سے پہلے کہ ان نکات پر بحث کروں، بطور تمہید کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ یہ نکات شائع ہوئے برصغیر میں علم اقتصادیات کا مطالعہ عام نہیں تھا۔ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلینڈ، امریکہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دانشوروں کا ایک مخصوص حلقہ اس علم کے اکتساب کی طرف مائل تھا۔ معاشیات پر باقائدہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن عوام کی توجہ اور دلچسپی اس مضمون کے متعلق بہت کم تھی۔ طلبا اس مضمون کو خشک سمجھ کر اس سے گریز کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۲۹ء/۱۹۳۰ء کی عظیم عالمی سرد بازاری کے بعد معاشیات کی اہمیت میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ امریکہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں معاشیات کے طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ خواتین خصوصاً یہ مضمون پڑھنے سے کتراتی تھیں۔ لیکن ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد حالات یک لخت بدل گئے اور معاشیات کے طلبا کی تعداد میں بے اندازہ اضافہ ہوا، اور اب تو امریکی ماہرین تعلیم اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ پرائمری سطح ہی سے طلبا کو معاشیات کی تعلیم دی جائے۔

بہرحال یہ امر واقع ہے کہ علم اقتصادیات میں عوام اور حکومتوں کی دلچسپی کا آغاز ۱۹۲۹ء/۱۹۳۰ء کی عالمی سرد بازاری کی وجہ سے ہوا۔ کساد بازاری کو قابو میں لانے کے لیے کلاسیکی نظریات موجود تھے لیکن اس عظیم عالمی کساد بازاری نے ان نظریات کو باطل کر دیا اور اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس

کی گئی کہ ایک ایسے نئے نظریہ کی ضرورت ہے جو اس کساد بازاری پر قابو پانے میں مدد دے سکے۔ بالآخر ۱۹۳۶ء میں ایک انگریز ماہر اقتصادیات جے ایم کینز J.M. Keynes نے اپنا مشہور زمانہ ''نظریہ روزگار و آمدنی'' پیش کیا جو اقتصادیات کے میدان میں ایک انقلاب کا سبب بنا۔ اس انقلابی نظریہ نے حکومتوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اس عالمی سرد بازاری پر مکمل قابو پالیں کینز کو ان کی خدمات کے صلہ میں تاج برطانیہ نے لارڈ کے خطاب سے نوازا جو کسی بھی انگریز کے لیے اعلیٰ ترین خطاب ہے اور باعث افتخار۔

اس تمہید سے میری غرض صرف اتنی ہی ہے کہ ناظرین یہ ذہن نشین کر لیں کہ جدید اقتصادی نظریات کی ابتداء ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہوئی اور یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ نگاہ مرد مومن نے ان جدید اقتصادی تقاضوں کی جھلک ۱۹۱۲ء ہی میں دکھادی تھی۔ اگر ۱۹۱۲ء سے مولانا احمد رضا خان بریلوی کے نکات پر غور وفکر کیا جاتا اور صاحب حیثیت مسلمانان ہند اس پر عمل کرتے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت معاشی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہوتی۔

آیئے اب ان نکات پر الگ الگ بحث کی جائے جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا بریلوی کے ان نکات کی تعداد چار ہے جس میں سے تین کا تعلق میرے نزدیک جدید اقتصادیات کی روح سے ہے اور چوتھا علم دین کے ترویج واشاعت سے متعلق ہے۔

ا۔ پہلا نکتہ یہ ہے۔

"ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ھے مسلمان اپنے معاملات باھم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپئے خرچ ھورھے ھیں پس انداز ھوسکیں۔"

اس نکتے میں اہم بات ''پس اندازی'' ہے۔ فضول خرچی کی مذمت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی کر دی تھی جدید ماہرین اقتصادیات فضول خرچی کی بے حد مذمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر پیداواری کاموں پر کیے جانے والے اخراجات قطعاً غیر پیداواری حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر برصغیر کے مسلمانوں کی بیسویں صدی عیسوی میں پاکستان بننے سے پہلے تک کی اقتصادی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے باہمی مقدمہ بازیوں پر کروڑوں

روپے ضائع کیے۔ یوپی میں تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں ۱۴ر فیصد تھی لیکن اقلیت ہونے کے باوجود وہ ایک باعزت اور پروقار زندگی گزار رہے تھے۔ مسلمانوں کی اقتصادیات اوران کی خوشحالی کا انحصار زمینداری پر تھا۔ یوپی میں مسلم نوابین، راجاؤں اور زمینداروں کی کمی نہ تھی۔ زمیندار اس صوبے میں وہ افراد ہوتے تھے جو کم ازکم ایک گاؤں کے مالک ہوتے تھے۔ لیکن میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حضرات مقدمہ بازیوں میں پھنسے رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مقدمہ بازی ان صاحبان کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے، میرے ایک قریبی عزیز جو زمیندار تھے بارہ برس سے مسلسل ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہم زلف سے مقدمہ بازی کے سلسلے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل نے یوپی کے مسلمانوں کی معیشت پر زمینداری کا خاتمہ کر کے بھرپور وار کیا اور مسلمانوں کی اقتصادیات کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی کے پہلے نکتے سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ وہ مقدمہ بازی پر کیے جانے والے اخراجات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس طرح مسلمان آپس میں مخالفت پر تلے رہتے تھے دوسری اور اہم بات یہ تھی کہ یہ کروڑوں روپیہ جو مقدمہ بازی کی نذر ہورہا تھا کاش کہ اگر بچایا جاسکتا تو مسلمانوں کے کس قدر کام آتا۔ یہ اخراجات قطعاً غیر ضروری تھے۔ اگر مفاہمت اور سمجھ بوجھ سے کام لیا جاتا تو اکثر و بیشتر مقدمات کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی اور معاملات باہمی صلاح ومشورے سے طے ہوجاتے اور مسلمانوں کا سرمایہ غیروں کی تقویت کا باعث نہ بنتا۔

امام احمد رضا خان نے ۱۹۱۲ء میں پس اندازی کی ہدایت فرمائی تھی کیوں کہ انہیں احساس تھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کا یہی بہترین علاج ہے کہ وہ غیر ضروری اخراجات یکسر ختم کردیں اور اس طرح جو کچھ پس انداز ہو وہ اپنی فلاح و بہبود پر صرف کریں۔ ۱۹۳۶ء میں کینز نے اپنا ''نظریہ روزگار و آمدنی'' پیش کر کے جدید اقتصادیات کی بنیاد مضبوط کی۔ اس کے نظریہ کی اہم ترین ''مساوات'' میں بچت اور سرمایہ کاری سب سے اہم متغیرات Variables ہیں اس کے نزدیک معیشت میں اقتصادی توازن کے لیے یہ شرط ہے کہ بچت = سرمایہ کاری Saving = Investment جب تک یہ شرط پوری ہوتی رہے گی سرمایہ دارانہ معیشت میں توازن برقرار رہے گا۔ لیکن جہاں ان دونوں میں عدم مساوات پیدا ہوئی معیشت کا توازن بگڑ جائے گا۔ یا تو معاشرہ کساد

بازاری کا شکار ہوجائے گا یا افراط زر کا۔ دونوں ہی صورتیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی نقطہ نظر سے خطرناک ہیں لہٰذا کوشش اس بات کی ضروری ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری میں توازن برقرار رہے۔ فردیا افراد کے لیے یہ توازن لانا بے حد مشکل ہے۔ لہٰذا کینز نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ معاشی افعال میں بھرپور حصہ لیں۔ اب تک ماہرین معاشیات حکومتوں کو چند ضروری شعبوں (مثلاً دفاع، پولس، صحت، تعلیم اور رسل ورسائل وغیرہ) میں حصہ لینے کے علاوہ باقی شعبوں سے دور رہنے کی تجاویز دیتے تھے تاکہ معاشرہ میں فرد کی اقتصادی آزادی متاثر نہ ہو۔ حکومتیں اس پر عمل بھی کرتی تھیں لیکن ۱۹۲۹ء۔۱۹۳۰ء کی عالمی کساد بازاری نے قدیم ماہرین معاشیات کے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا۔ ادھر کینز کے مشورہ پر عمل کیا گیا، حکومتوں نے معیشت کے ہر شعبے میں بھرپور حصہ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو کساد بازاری سے نجات مل گئی اور کینز کو انگلینڈ کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا۔

موجودہ دور اقتصادی منصوبہ بندی کا دور ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک ملک کی خوشحالی میں اضافہ کے باقاعدہ منصوبے بناتے ہیں ان منصوبوں کی میعاد عموماً ۵ سال ہوتی ہے۔ انقلاب روس کے بعد کمیونسٹ ماہرین اقتصادیات نے روس کی معاشی ترقی کے لیے پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا۔ آج پسماندہ ممالک بھی اقتصادی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ روس کے بعد بیشتر ترقی پذیر ممالک میں پنجسالہ ترقیاتی منصوبوں کو مقبولیت بخشی ہے اور ان ممالک میں اقتصادیات کے ماہرین ملکی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندیوں میں مشغول ہیں۔ جہاں اقتصادی منصوبہ بندی میں دیگر اور باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں ماہرین اس بات کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں کہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے کن ذرائع سے رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔ منصوبوں کے لیے رقم دو ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱) ملکی بچت۔ (۲) قرضے۔

ملک میں اگر بچت کی شرح اونچی ہے تو ملکی ذرائع ہی سے منصوبوں پر عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن بچت کی شرح کم ہونے کی صورت میں حکومت کو غیر ملکی قرضوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ منصوبہ بندی کی تکمیل کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حسب ضرورت ملک کا مرکزی بینک نوٹ چھاپ چھاپ کر حکومت کے حوالے کرتا رہے لیکن یہ طریقہ ارزاں ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خطرناک بھی ہے اور اس سے ملک میں افراط زر آ جاتا ہے اور اگر افراط زر پر حکومت جلد قابو نہ پا سکے تو پھر اس کے نتائج انتہائی

سنگین ہوتے ہیں اور معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

لہٰذا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ملک میں بچتوں کی ہمت افزائی کی جائے اور لوگوں کو بچت کرنے پر مجبور کیا جائے۔ پسماندہ ممالک میں بچت کی شرح بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں بچت کی اہلیت بہت کم ہے کیوں کہ ان کی آمدنیاں بے حد قلیل ہیں اگر افراد کی آمدنیوں میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا بھی ہے تو افراد اسے اشیائے صرف پر خرچ کر دیتے ہیں ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ بیشتر ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری کی شرح ۵ فیصد سے ۸ فیصد ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح ۱۵ رفیصد سے ۱۸ رفیصد ہے یعنی ترقی پذیر ممالک اپنی قومی آمدنی کا صرف ۵ سے ۸ فیصد حصہ سرمایہ کاری کے لیے خرچ کرتے ہیں جب کہ اقتصادی ترقی کا تقاضا ہے کہ قومی آمدنی کا کم از کم ۱۵ رفیصد سرمایہ کاری کے لیے وقف کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کینز کی مشہور زمانہ مساوات (Equation) کے مطابق

بچت = سرمایہ کاری۔

اگر بچتیں زیادہ ہیں تو سرمایہ کاری زیادہ ہو گی لیکن بچتیں اگر کم ہیں تو اقتصادی ترقی کی رفتار بے حد سست ہو گی۔ ۱۹۵۰ء میں ایک امریکی ماہر اقتصادیات کولن کلارک Collin Clark نے بھارت، چین اور پاکستان کے لیے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں کے افراد کم از کم قومی آمدنی کا ۱۲ رفیصد پس انداز کریں اور اسے سرمایہ کاری میں لگائیں۔ لہٰذا آج کل ہر ملک میں خواہ وہ پسماندہ ہو یا ترقی یافتہ، بچت میں اضافے کے لیے مختلف اسکیموں پر عمل کیا جاتا ہے۔ خود پاکستان میں ہماری حکومت نے ایسی بہت سی اسکیمیں رائج کر رکھی ہیں جن سے چھوٹی چھوٹی بچتوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ہمیں رقم کی ضرورت ہے اور اس رقم کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ملکی بچت کا ذریعہ ہے۔

اب اہل دل اور اہل نظر ذرا اس ماحول کو ذہن میں رکھیں جب کہ ۱۹۱۲ء میں مولانا احمد رضا خان نے مسلمانوں کو اس بات پر عمل کرنے کی تلقین کی تھی کہ وہ غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کریں اور زیادہ سے زیادہ پس انداز کریں اور آج کے ماحول پر نظر ڈالیں۔ جب کہ حکومتیں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ عوام زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔ کیا آپ اب بھی قائل نہ ہوں گے مولانا کی دور اندیشی کے!

کیا اب بھی آپ کو یقین نہ آئے گا کہ مولانا کی دوررس نگاہیں مستقبل کو کتنا صاف دیکھ رہی تھیں!

کینز کو اس کی خدمات کے صلے میں اعلیٰ ترین خطاب مل سکتا ہے اس بنا پر کہ اس نے وہ چیز دریافت کر لی تھی جسے چوبیس سال قبل مولانا احمد رضا خان بریلوی شائع کروا چکے تھے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس طرف ذرہ برابر توجہ نہ دی۔

(۲) اب آیئے دوسرے نکتے کی طرف، مولانا نے فرمایا:

"ممبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بینک کھولیں۔"

یہ معاشی نقطہ نظر سے اس قدر اہم ہے کہ ہمیں مولانا احمد رضا خان کی اقتصادی سمجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کے صرف چند بڑے بڑے شہروں میں بینک قائم تھے۔ جن کی ملکیت انگریزوں یا ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ برصغیر میں ۱۹۴۰ء تک کوئی مسلم بینک موجود نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں بینک اور بینکوں کی اہمیت کا اندازہ لگالینا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولانا کی نگاہوں سے معاشیات کے مستقبل کے اس اہم ادارے کی اہمیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اور انہوں نے مال دار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے بینک قائم کریں۔

سود کی بے پناہ مضرت رسانیوں کے متعلق مولانا احمد رضا خان نے اپنی دیگر کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے لہٰذا یہ امر یہاں واضح ہے کہ مولانا احمد رضا خان کی مراد ایسا بینک کاری نظام تھا جو غیر سودی بنیاد پر استوار ہو۔

جدید اقتصادی ڈھانچے بینکنگ بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ایک مستحکم بینکنگ نظام ملکی معیشت کو تازہ وصحت مند خون فراہم کرتا ہے۔ بینک وہ ادارے ہیں جو لوگوں کی بچتوں کو پیداواری کاموں میں لگانے کا ذریعہ ہیں۔ آج کا معاشی نظام بغیر بینکنگ کے عضو معطل ہو کر رہ جائے گا۔ اسی وجہ سے موجودہ اقتصادی نظام کو ایک Compound Interest System کہا جاتا ہے یعنی ایک ایسا نظام جس کی بنیاد سود مرکب پر ہے۔ ایسے نظام میں بینکوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقتصادی منصوبہ بندی میں سرمایہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے کوئی بھی اقتصادی منصوبہ خواہ

وہ کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو بغیر سرمائے کے تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتا۔ اقتصادی ترقیاتی منصوبوں میں بینکوں کے سپرد یہ اہم کام ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ کی قلت کو دور کریں اور بچت اور سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کریں۔ ایک مضبوط بینکنگ نظام چھوٹی چھوٹی بچتوں کو اس طرح یکجا کر کے کام میں لاتا ہے کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے اقتصادی منصوبے پایہ تکمیل کو جا پہنچتے ہیں۔ اس طرح بینک دو اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔

(۱) وہ لوگوں کی چھوٹی یا بڑی رقمیں جمع کرتے ہیں۔ اور

(۲) ان رقموں کو ایسے افراد کو قرض دے دیتے ہیں کہ جو انہیں پیداواری کاموں پر صرف کر سکیں۔ پیداواری کاموں سے مراد ان کاموں سے ہے جن کا نتیجہ ایسی اشیاء خدمات کی پیدائش میں ہوتا ہے جو مستقبل کی پیدائش دولت میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تو گویا بینکوں کی اہمیت موجودہ معاشرہ میں مسلّم ہے۔ قائد اعظم انتہائی دور اندیش اور مدبر سیاست دان تھے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بات ان پر روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک مضبوط بینک کی سخت ضرورت ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہو۔ لہٰذا انہوں نے اس بات پر بے حد اصرار کیا کہ مسلمانان ہند کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا بینک فوری طور پر قائم کیا جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے۔ لیکن اس کے باوجود صرف ایک بینک (حبیب بینک) مسلمانوں کا ہے۔ جس کے ملک میں سینکڑوں بینک سرگرم علم ہیں۔ جن کی ملکیت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے۔ قائد اعظم کے مسلسل اصرار سے متاثر ہو کر مرحوم سر آدم جی داؤد اور مرزا احمد اصفہانی نے، جن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا۔ ۹ رجولائی ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں مسلم کمرشیل بینک قائم کیا۔ تقسیم ہند کے بعد اس بینک کے دفاتر پاکستان منتقل کر دیے گئے اور بہت جلد اس بینک نے اپنی شاخیں پاکستان کے اہم شہروں میں قائم کر دیں اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی سرگرمیوں میں یہ بینک انتہائی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

جدید ماہرین اقتصادیات نے پس اندازی کی دو قسمیں بتائیں ہیں۔

(۱) بچت (Saving) اور (۲) زر کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding)

اگر ایک فرد کی ماہانہ آمدنی ۱۰۰ روپے ہے جس میں سے وہ اسی روپے اپنی ضروریات زندگی پر خرچ کرتا ہے تو اس کی ماہانہ بچت بیس روپے ہوگی۔ یہی حال قوموں کا ہے اگر قومی آمدنی قومی اخراجات کے مقابلے میں زیادہ ہے تو نتیجہ قومی بچت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اس بچائی ہوئی رقم کو افراد بینکوں میں جمع کرا سکتے ہیں یا بچت کی کسی اسکیم میں لگا سکتے ہیں یہ صورت حال بچت کہلاتی ہے لیکن اگر لوگ بچائی ہوئی رقم کو اپنے پاس ہی رکھیں تو یہ صورت Hording کہلائے گی۔ بچت کا تصور ذخیرہ اندوزی کے تصور سے اس لیے مختلف ہے کہ موخر الذکر تصور خالص نفسیاتی ہے جس میں فرد کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ دولت زر کی شکل میں جمع کرے اور اسے اپنے پاس ہی محفوظ رکھے۔

جب تک لوگ اپنی بچت بینکوں میں جمع کرائیں گے یا کسی بچت کی اسکیم میں لگائیں گے اس وقت معیشت میں توازن برقرار رہے گا۔ لیکن جس وقت لوگوں میں زر کو ذخیرہ کرنے کی خواہش بڑھ جائے گی تو معیشت عدم توازن کا شکار ہو جائے گی کیوں کہ کینز کی مساوات

بچت = سرمایہ کاری

غیر متوازن ہوگی۔ ایسی صورت میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے معیشت میں یا تو افراط زر پیدا ہو جائے گا، یا کساد بازاری پھیل جائے گی اور ہزاروں افراد و ملکی وسائل بے روزگار و بے اثر ہو جائیں گے جس سے معاشرہ میں بے شمار سماجی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

اب بچت اور بینک کا تعلق قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ موجودہ معیشت میں بچت اور بینک ہماری اقتصادی زندگی کے لیے کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ بچت اور بینک آج کی دنیا میں دو ایسے الفاظ ہیں، جن سے ہمارے معاشرے کا بچہ بچہ واقف ہو چکا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھئے، ریڈیو سنئے، یا اخبارات کا مطالعہ کیجیے، آپ کو ہر قدم پر ان دونوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ اقتصادی تعلیم محدود تھی، کسے معلوم تھا کہ تیس چالیس سال کے بعد بچت اور بینک کس قدر اہمیت اختیار کر جائیں گے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے مستقبل میں جھانک لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف فضول خرچی سے باز رکھنے کی تلقین کی، نہ صرف پس اندازی کی ہدایت کی بلکہ صاحب حیثیت اور دولت مند مسلمانان ہند سے اپیل کی، کہ وہ اپنے بھائیوں کی

مدد کے لیے بینک قائم کریں۔ وہ بینک جہاں کم حیثیت کے مسلمان اپنی چھوٹی بچائی ہوئی رقم محفوظ رکھ سکیں اور جہاں سے باصلاحیت مسلمان آجروں کو سرمایہ فراہم ہو سکے اور وہ صنعت کاری کے میدان میں ہندوؤں کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکیں۔

پاکستان ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا۔ ہندو مجبور ہو گیا تھا کہ وہ برصغیر کی تقسیم کو قبول کرلے لیکن وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ معاشی طور پر پاکستان کی زندگی چند روزہ ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ پاکستان کے خزانے خالی تھے۔ صنعت اور بینکنگ میں مسلمان ناتجربہ کار تھے۔ اس میدان میں گویا ایک خلا تھا۔ جس کو تیزی کے ساتھ پر کرنا انتہائی ضروری تھا۔ پاکستان ارباب اقتدار کو اس خلا کو پر کرنے کے لیے جن مشکلات کا سامان کرنا پڑا، وہ بے شمار تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خدا کے فضل وکرم سے حالات پر قابو پالیا گیا آخر تو یہ مملکت خداداد تھی، جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔

میں سوچتا ہوں کہ کاش ۱۹۱۲ء میں چند ایک ہی ایسے اہل دل مسلمان ہوتے جو مولانا احمد رضا خان کے ارشادات پر عمل کر لیتے، تو مسلمانوں کو اقتصادی تاریخ برصغیر میں یقیناً مختلف ہوتی اور پاکستان کو انتہائی نامساعد معاشی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ایسی گہری سوچ اور ایسے نکات جن کے نتائج اس قدر دوررس ہوں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں یہ تو صرف مردمومن کا کمال ہے۔ اس مردمومن نے تونگر مسلمانوں کو دعوت دی کہ مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا بینک قائم کرو تاکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت سنبھلے۔ یہی بات ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے دوہرائی۔ اگر ۱۹۱۲ء میں سرآدم جی اور مرزا اصفہانی جیسے دو چار اور مولانا احمد رضا خان کی ہدایت پر عمل کر لیتے، تو مسلمانوں کا معاشی مستقبل بہت کچھ سنور جاتا اور اس کے اقتصادی نتائج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے، بلکہ مسلمان عالم کے لیے بے حد خوشگوار ثابت ہوتے۔

اب ہم مولانا احمد رضا خان کے تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا:

(۳) مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔

ذرا اس نکتہ پر غور فرمایئے موجودہ عالمی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ مسلمانوں نے اس عالم دین کے اس زریں اصول کو نہ سمجھا اور نہ ہی اس پر عمل کیا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی یورپ کی جنگ سے متاثر ہونے والے ممالک نے اس پر عمل کیا اور آج یہ ممالک اقتصادی طور پر

دنیا کے مستحکم ترین ممالک سمجھے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں میں نے اپنے بچپن میں جب کہ دوسری جنگ عظیم زور و شور سے جاری تھی اکثر مسلمانوں کی دکانوں پر یہ شعر چسپاں دیکھا تھا۔

زندگی عزت کی مسلم ہند میں چاہے اگر
تو یہ لازم ہے کہ سودا جب بھی لے مسلم سے لے

یہ غالبًا امام احمد رضا کے اس نکتے کی بازگشت تھی اس شعر نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا لیکن صاحب حیثیت مسلمانوں کو میں نے ہندوؤں کی دوکانوں سے خرید و فروخت کرتے دیکھا۔ مسلمانوں میں اس وقت بھی ماہرین اقتصادیات موجود تھے لیکن بدقسمتی سے ان کی نگاہیں مغربی مفکرین کی جانب لگی ہوئی تھیں وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ خود ان کا ایک عالم اقتصادیات کے بارے میں کیسے کیسے موتی ان کے سامنے بکھیر گیا ہے وہ اپنے خزانے سے بے خبر رہے لیکن مغربی خزانوں کی طرف حسرت و یاس سے دیکھتے رہے اور کسی نے بھی مولانا کے اس نکتے پر غور نہیں کیا نہ ہی اسے سمجھا اور نہ ہی وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ اگر اس وقت کوئی بھی مسلمان ماہر اقتصادیات اس نکتے کے دوررس اثرات کی وضاحت کر دیتا اور مسلمان صرف مسلمانوں ہی سے خرید و فروخت کرنے لگتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان ہندوستان میں معاشی اعتبار سے دوسری قوموں کے مقابلے میں پست ہوتے۔

معاشیات میں اس بات پر گرما گرم بحث ہوتی رہی اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے کہ بین الاقوامی تجارت آزاد ہونی چاہیے یا اس پر پابندیاں ضروری ہیں۔ تامین (Protection) کے خلاف اور موافقت میں بڑے بڑے یورپین اور امریکی ماہرین معاشیات نے دلائل پیش کیے ہیں۔ آدم اسمتھ Adam Smitch کو جسے معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے آزاد بین الاقوامی تجارت کا سب سے بڑا حامی سمجھا جاتا ہے آزادی عالمی تجارت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مملکتوں کے مابین اشیا و خدمات کی آمد رفت پر پابندیاں نہیں ہیں یا اگر ہیں تو برائے نام ہیں۔ اس کے برخلاف تامین وہ تحفظ ہے جو حکومت ملکی صنعتوں کو غیر ملکی مقابلے سے بچانے کے لیے دیتی ہے۔ آدم اسمتھ کی کتاب 'دولت اقوام' ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی تھی ۱۷۹۱ء میں امریکہ کے ایک سیاستدان الیگزینڈر ہملٹن نے تامین کی پالیسی کی پرزور حمایت کی اور آزاد بین الاقوامی تجارت کی مخالفت جرمنی میں فریڈرک لسٹ نے تامین کی حمایت

میں پرزور دلائل دیتے ہوئے سب سے پرزور دلیل جو تامین کے حق میں دی جاتی ہے وہ یہ کہ ملک کی نوزائیدی صنعتیں بیرونی مقابلے میں اس وجہ سے تحفظ کی مستحق ہیں کہ وہ مضبوط بیرونی صنعتوں کا اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں قطعاً مقابلہ نہیں کرسکتیں ان کی حفاظت حکومت کا فرض ہے ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قبل ہی بیرونی مقابلے کے سامنے دم توڑ دیں۔

ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تامین اس لیے ضروری ہے کہ ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی ہے اور روزگار میں اضافہ ہوتا ہے نیز یہ جذبہ حب الوطنی کے فروغ کا باعث ہے۔

اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو تامین کے حق میں دیے گئے ہیں مگر میں صرف مندرجہ بالا دو دلائل کے متعلق امام احمد رضا خان بریلوی کے تیسرے نکتے کی روشنی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے برصغیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی ۱۹۱۲ء میں انگریزی حکومت ہندوستان میں انتہائی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس وقت کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف ۳۵ سال بعد فرنگی اس سرزمین کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

مسلمانوں کا اب اپنا کوئی ملک نہ تھا لیکن مسلم قوم اب بھی موجود تھی جسے اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ انہوں نے کیا گم کر دیا ہے حکومت ختم ہو چکی تھی مگر قوم اب بھی موجود تھی۔ اس قوم کی سماجی، مذہبی اور معاشی بقا کے لیے مضبوط بنیادوں پر اہل نظر اور اہل علم مسلمانوں کو پالیساں وضع کرنی تھیں تعلیمی سیاسی اور معاشرتی میدان میں مسلم لیڈران سرگرم عمل تھے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد تیز تر ہوتی جارہی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر کسی نے بھی مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور اس سے نمٹنے کے لیے کوئی پالیسی وضع نہ کی۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اپنے معاشی نکات پیش کیے جن پر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے کوئی غور و فکر نہیں کیا تعلیم یافتہ مسلمان اپنی رہبری کے لیے مغربی علما کا سہارا لے رہے تھے اور اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے درمیان ایک ایسے باوصف انسان کو بھیج دیا ہے کہ جس کے ارشادات پر اگر مسلمان عمل کرتے تو کب کے اپنی غربت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کر کے باعزت زندگی بسر کرنے لگتے۔

مولانا احمد رضا خان کا تیسرا نکتہ میرے نزدیک معاشی اعتبار سے انتہائی اہم ہے وہ مسلمانوں کو معاشی تحفظ دینا چاہتے تھے۔ روزگار اور تجارت کے میدان میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔

بنیوں کی ذہنیت اور فطرت یہی تھی کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں کوئی تجربہ نہ تھا اور اگر مسلمان تجارت کرنا بھی چاہتے تو اول تو ہندو اپنے مقابلے میں انہیں میدان سے بھگا دیتے تھے اور دوسرے اپنوں کی بے اعتنائی ان کا دل توڑ دیتی تھی۔ امام احمد رضا پر یہ باتیں روز روشن کی طرح عیاں تھیں اس کا صرف ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ مسلمان مسلم تجارت پیشہ افراد کو تحفظ دیں اور خرید و فروخت صرف مسلمانوں ہی سے کریں، یعنی اعلیٰ حضرت نے جدید اقتصادی زبان میں مسلمان دوکانداروں کے لیے مسلمان بھائیوں سے تامین کی اپیل کی۔ مسلمان دکانداروں کی مثال بالکل اس نوزائیدہ صنعت کی سی تھی جسے سخت ترین بیرونی مقابلے کا سامنا تھا اور ان کی بقا اس صورت میں تھی کہ مسلمان ان کی سرپرستی کریں۔ یہاں کسی ملکی صنعت کو تحفظ نہیں دینا تھا، بلکہ اپنی قوم کی اس جماعت کی حفاظت مقصود تھی، جو معاشی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے کوشاں تھی۔

اب اگر مسلمانانِ ہند امام احمد رضا خان کے ارشاد پر عمل کرتے، تو اس کے اقتصادی نتائج کیا ہوتے؟ مسلمانوں کا پیسہ مسلمان دوکانداروں کے پاس جاتا۔ اپنے طور پر یہ مسلمان تاجر مسلمان تھوک فروشوں سے زیادہ سامان حاصل کرتے۔ مسلم تھوک فروش مسلم صنعت کاروں سے زائد اشیا خریدتے اور جب موثر طلب میں اس طرح اضافہ ہوتا، تو مسلمان صنعت کار زیادہ اشیا پیدا کرتے۔ کیوں کہ ان کی اشیا کی طلب میں اضافہ ہوتا۔ اشیا کو پیدا کرنے کے لیے وسائل پیدائش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی زمین محنت اور سرمائے کی۔ مسلمان صنعت کار، جب اشیا کی پیداوار میں اضافہ کرتے، تو یقیناً وہ بے روزگار مسلمان، جو تلاش روزگار میں سرگرداں تھے، ملازمتیں حاصل کر لیتے اور جب ان افراد کی آمدنیوں میں اضافہ ہوتا، تو ان کی موثر طلب بڑھ جاتی اور معاشیات کا وہ چکر شروع ہو جاتا، جو کسی بھی معیشت کو خوشحال کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان صنعت کار سرمایہ کہاں سے لاتے، تو اس کا جواب مولانا احمد رضا خاں کے پہلے دو نکات میں پوشیدہ ہے کہ مسلمان بچت کریں اور صاحب حیثیت مسلمان بینک قائم کریں۔ بینک جن کا اولین مقصد پیداواری کاموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

کینز کے نظریہ ''روزگار و آمدنی'' میں موثر طلب (Effective Demand) بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تیسرے نکتہ میں موثر طلب کا خیال واضح طور پر

موجود ہے۔ سارا کریڈٹ کینز کو جاتا ہے اور ہم اپنے عالم کے ارشادات سے قطعاً بے خبر، مغربی ماہرین معاشیات کو داد دیتے رہتے ہیں۔ قسمت کی اس ستم ظریفی کو ہم کیا نام دیں گے۔ خوان نعمت ہمارے سامنے لگا ہوا ہے لیکن ہماری نگاہیں مغرب کی ڈنر ٹیبل پر لگی ہوئی ہیں۔

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ کے اس نکتے پر مغربی دنیا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کتنا عمل کیا ہے۔ مغربی یورپ کے ممالک مثلاً جرمنی، فرانس اور اٹلی وغیرہ اس جنگ میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ خصوصاً جرمنی اور اٹلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جرمنی کی ''بندر بانٹ'' ہوئی۔ ایک حصہ روسیوں کے پاس اور دوسرا اتحادیوں کے قبضے میں آیا۔ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو کر مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی بن گیا۔ جرمنی کی اقتصادی و معاشی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ یہی حالت فرانس اور اٹلی کی تھی۔ لیکن جرمنی نے جلد ہی اپنی حالت کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ وہاں کے دانش مندوں نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی کہ جرمنی کو اگر زندہ رکھنا ہے، تو اقتصادی بحالی فوقیت کے لحاظ سے اول نمبر پر ہے۔ جنگ کی تباہی کے بعد مغربی جرمنی تنہا اپنی معیشت کو بحال نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا روم میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یوروپین مشترکہ منڈی (European Common Market) کا قیام عمل میں آیا۔ جو کچھ مغربی یوروپی ممالک پر مشتمل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ عالمی سیاست میں امریکہ کا طوطی بول رہا تھا اور عالمی معیشت میں امریکی ڈالر کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس منڈی کے قیام کے پس پشت جو نظریہ کارفرما تھا وہ بعینہ وہی تھا جس کی ہدایت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے تیسرے نکتے میں فرمائی تھی۔ یعنی مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔ معاہدہ روم، جس کے تحت اس منڈی کا قیام عمل میں آیا تھا، ان شرائط وضوابط پر مشتمل تھا کہ منڈی کے اراکین ان اشیا کو پیدا کریں گے۔ جن کی پیدائش پر انہیں دوسرے ممالک پر فوقیت حاصل ہے۔ منڈی کے اراکین ممالک خود کو ایک وحدت خیال کریں گے۔ آپس میں تجارت آزادانہ ہو گی یعنی تجارت پر کوئی پابندی نہ ہو گی۔ وسائل پیدائش کی منتقلی پر پابندیاں نہ ہوں گی۔ درآمدات پر بھاری ٹیکس لگائے جائیں گے اور برآمدات رعایتوں کی مستحق ہوں گی۔ جو اشیا منڈی کے اراکین پیدا کر سکتے ہیں، انہیں باہر سے نہیں منگوایا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ خرید و فروخت آپس ہی میں ہو گی۔

منڈی کے قیام کے وقت غالباً اراکین کو بھی اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ یہ ادارہ انتہائی مستحکم اقتصادی ادارہ بن گیا۔ منڈی کے اراکین کی معیشت انتہائی مضبوط خطوط پر قائم ہوئی۔ مالی اعتبار سے اراکین کی حیثیت بے حد مضبوط ہوگئی اور ہم نے دیکھا کہ عالمی اقتصادیات میں امریکن ڈالر کی حیثیت ثانوی رہ گئی اور جرمن مارک دنیا کی مضبوط ترین کرنسی بن گیا۔

یوروپین مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی نے معاشیات کی ایک نئی شاخ کو جنم دیا جسے ہم Theory of Economic Integeration کے نام سے جانتے ہیں۔اس پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔

مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی سے متاثر ہوکر یورپ کے تقریباً دس ممالک نے، جس میں برطانیہ بھی شامل تھا ایک یوروپین فری ٹریڈ ایریا (European Free trade Area) قائم کرلیا۔لیکن وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی، جو یوروپین مشترکہ منڈی کو ہوئی۔ پاکستان، ایران اور ترکی کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا اور جسے ہم آر سی ڈی کے نام سے جانتے ہیں انہیں خطوط پر تھا۔لیکن اس ادارہ کو وہ کامیابی نہ ہوسکی، جس کی توقع کی جاتی تھی۔ آر سی ڈی کو کامیاب بنانے کے لیے تینوں ممالک کے سربراہوں کی ایک کانفرنس ۲۶/اپریل ۱۹۷۶ء کو ازمیر (ترکی) میں منعقد ہوئی تھی۔لیکن ابھی تک کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اگر تینوں ممالک صدق دل اور نیک نیتی سے اس ادارے کی کامیابی کے لے کوشش کریں، تو کامیابی نصیب نہ ہو۔

بہر حال اس تمام بحث سے غرض یہ تھی کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے جو نکتہ بیان فرمایا تھا۔ اگر مسلمان صدق دل سے اس پر عمل کرتے تو انہیں بھی یقیناً وہی کامیابی ملتی جو یوروپین مشترکہ منڈی کے حصے میں آئی۔ ہمارے ایک عظیم عالم دین نے ہمارے لیے چراغ جلا کر رکھ دیا تھا۔ جس کی روشنی میں ہمیں صحیح راستے کا تعین کرنا تھا۔لیکن افسوس راستے کا تعین تو درکنار، ہم نے اس شمع ہدایت کو بھی نظر انداز کردیا۔اسے ہم صرف اپنی بدنصیبی اور کوتاہ بینی سے تعبیر کرسکتے ہیں یا پھر یہ کہ معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی اصطلاحات میں راہبران ملت ایسے الجھے کہ انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی، جو یقیناً حیرت انگیز اور قابل افسوس امر ہے۔ جب کہ ان کی ہدایت کے لیے اتنے واضح نکات مولانا احمد رضا خاں نے ۱۹۱۲ء میں واضح فرمادیے تھے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا چوتھا نکتہ گو کہ اقتصادیات کے متعلق نہیں، لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

(۴) علم دین کی ترویج و اشاعت کریں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سرسید کی تعلیمی اصلاحات کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا حصول بذاتِ خود ایک اچھی بات تھی۔ مسلمانوں کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔ لیکن جو بات تشویش ناک تھی اور جسے مولانا کی ذات گرامی نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل مغربی تہذیب کی بھی دلدادہ ہوتی جا رہی تھی یعنی کوا ہنس کی چال اختیار کر رہا تھا جو کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ اگر مسلمان علم دین سے بے بہرہ ہو گئے، تو وہ اپنی حیثیت وانفرادیت کو گم کر بیٹھیں گے۔ نئی تہذیب ان کی وحدت کو ختم کر دے گی اور ان کا وہی حال ہو گا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اکبر الٰہ آبادی نے بھی یہ بات بخوبی محسوس کر لی تھی اپنی شاعری کے تیز و تند نشتروں سے انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے کا احساس دلایا۔ انہیں سمجھایا کہ اپنی اصلیت مت بھولو۔ تمہارا سب سے بڑا خزانہ تمہارا مذہب اور تمہاری تہذیب ہے۔ لیکن "رِفارم" (Reform) کا چکر اتنا تیز تھا کہ مسلمان اس طرف متوجہ نہ ہوئے اور اکبر الٰہ آبادی نے فرمایا کہ ؎

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے رہے پیسہ نہ ملا

اور یہ کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مغربی تہذیب نے ایسا رنگ جمایا اور نوجوانوں کو اپنی رنگینیوں کا ایسا متوالا بنایا کہ وہ اپنے

معاشرے، تہذیب اور مذہب سے دور ہوتے چلے گئے اور فرنگی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے گئے۔

مذہب سے بیگانگی نے برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو بے حد نقصان پہنچایا۔ لیکن جب قائداعظم محمد علی جناح نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہا، تو مسلمان پروانہ واران کے گرد جمع ہو گئے۔ اسلامی غیرت وحمیت اس وقت بھی مسلمانانِ ہند میں موجود تھی جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مسلمانوں کو ایک نیا ملک نصیب ہوا جو اس بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں۔ ان کی ثقافت وتہذیب ہندوؤں سے مختلف ہے۔ مگر بدنصیبی تو ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام کے نام پر علاحدہ مملکت تو وجود میں آ گئی مگر ترویج دین کی طرف اہل اقتدار نے کوئی توجہ نہ دی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مملکت اسلامیہ پاکستان کو صحیح طور پر ایک اسلامی ملک بنایا جاتا۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت ہوتی۔ نوجوانوں کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرایا جاتا۔ انہیں بتایا جاتا کہ پاکستان کے حلیے برصغیر کے مسلمانوں نے کس لیے جدوجہد کی تھی اور بے شمار قربانیاں کیوں دی گئیں تھیں۔ لیکن افسوس کہ اس طرف سے توجہ ہٹالی گئی۔ اقتدار کے لے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ ابھی ملک کی جڑیں مضبوط بھی نہ ہوئی تھیں کہ طوفان حوادث نے اسے آ گھیرا۔ مذہب سے بیگانگی نے اور بھی غضب ڈھایا۔ ہم نے خود کو صوبوں سے خصوصیت دے لی اور یہ بھول گئے، ہم اول وآخر صرف مسلمان ہیں۔

ہمارے ملک پر جو آفات نازل ہوئیں ان کا بنیادی سبب ہماری مذہب سے بیگانگی تھا۔ اگر ابتدا ہی سے علم دین کی ترویج واشاعت پر زور دیا جاتا تو ہمیں یہ برے دن ہرگز نہ دیکھنا پڑتے۔

آج ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہماری نئی نسل کو جو مغرب کی تقلید میں دیوانی ہوئی جارہی ہے۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں نیک نیتی سے کوششیں شروع کر دی جائیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری نسل اپنی منزل کو نہ پالے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(بشکریہ سالنامہ 'معارف رضا' ۱۹۹۲ء کراچی)

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی
ایم اے، پی ایچ ڈی، بریلی شریف

امام احمد رضا اور طب وحکمت

(طب ومیڈیکل کے اراکین کے لیے)

عصر حاضر میں طب وحکمت تیزی سے مائل بہ زوال ہے۔ اطبا وحکما خال خال ہی نظر آتے ہیں اور عالم یہ ہے کہ طبیہ کالجوں میں بھی ایلو پیتھک یا انگریزی طریقۂ علاج نے اپنا عمل دخل بنالیا ہے۔ ان طبیہ کالجوں کے فارغین خود کو حکیم کہنے میں ہتک محسوس کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب طب وحکمت کی دھوم تھی۔ طبابت کا پیشہ بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اور اطبا یا حکما اس پیشے کو خدمت خلق کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور اس پیشے کو اختیار کرنے کا ان کا مقصد محض دولت کا حصول نہیں تھا۔

علمائے کرام میں بھی اکثر طبیب ہوا کرتے تھے اور علم دین کے ساتھ ساتھ وہ طب وحکمت کا فن بھی حاصل کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کا تعلق طب سے رہا ہے، ان کی سوانح سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی انہوں نے اپنے علوم وفنون میں اس کا کہیں تذکرہ کیا ہے۔ البتہ ان کی تصانیف اور مکاتیب کے مطالعہ سے اس فن میں ان کی وسیع طبی معلومات کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں امام احمد رضا رضی الرحمٰن نے طبابت کی مشکلات اور اس کی باریکیوں، طبیب کے فرائض، امراض کی تشخیص اور مریضوں کی نفسیات سے متعلق انہیں جو ہدایات فرمائی ہیں۔ ان سے طب وحکمت کے فن میں آپ کی وسعت معلومات بلکہ ایک طرح سے اس فن میں بھی آپ کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

”جانِ برادر! مشکل ترین امور ہنگامہ استخراج احکام جزئیہ ہیں۔ جیسے فقہ وطب، جس طرح فقہ میں صدہا حوادثات ایسے پیش آتے ہیں۔ جن کا جزئیہ کتب میں نہیں اور ان پر حکم لگانا ایک سخت دشوار گزار

پہاڑ کا عبور کرنا ہے۔ جس میں بڑے بڑے ٹھوکریں کھاتے ہیں بعینہ یہی حال طب کا ہے بلکہ اس سے بھی نازک تر، بالکل بے دیکھی چیزوں پر حکم کرنا ہے، پھر اگر آدمی قابلیت تامہ نہیں رکھتا اور برائے خود کچھ کر بیٹھا اگرچہ اتفاق سے ٹھیک ہی اتری گنہگار رہوگا۔ جس طرح تفسیر قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا: **من قال فی القرآن برائه فاصاب فقد اخطا** جو قرآن میں اپنی رائے سے کہے اور ٹھیک ہی کہے جب بھی خطا ہے۔ یوں ہی حدیث شریف میں فرمایا: جو علاج کرنے بیٹھا اور اس کا طبیب نہ ہونا معلوم ہوا اس پر تاوان ہے یعنی اس کے علاج سے کوئی بگڑ جائے گا تو اس کا خون بہا اس کی گردن پر ہوگا، اگرچہ تمہارے استاذ شفیق نے تمہیں مجاز و ماذون کردیا، مگر میری رائے میں تم ہرگز ہرگز ہنوز مستقل تنہا گوارا نہ کرو اور جب تک ممکن ہو مطب استاذ کا دیکھتے اور اصلاح لیتے رہو۔ میں نہیں کہتا کہ جداگانہ معالجہ کے لیے نہ بیٹھو، مگر اپنی رائے کو ہرگز رائے نہ سمجھو اور ذرا سی بات میں بھی اساتذہ سے استعانت لو۔

۲۔ رائے لینے میں کسی چھوٹے بڑے سے عار نہ کرو۔ کوئی عالم کامل نہیں ہوا، جب تک آدمی بعد فراغ درس اپنے آپ کو جاہل نہ جانے۔ جس دن اپنے آپ کو عالم مستقل جانا، اسی دن اس سے بڑھ کر کوئی جاہل نہیں!

۳۔ کبھی محض تجربے پر بے تشخیص حادثہ خاصہ پر اعتماد نہ کرو۔ اختلاف فصل، اختلاف بلا، اختلاف عمر، اختلاف مزاج وغیرہ بہت باتوں سے علاج مختلف ہوجاتا ہے۔ ایک نسخہ ایک مریض کے لیے ایک فصل میں صدہا بار مجرب ہو چکا، کچھ ضروری نہیں کہ دوسری فصل میں بھی کام دے، بلکہ ممکن ہے کہ ضرر پہنچائے **وعلیٰ ھذا اختلاف البلاد والاعمار والامزجه وغیرھا**۔

۴۔ مرض کبھی مرکب ہوتا ہے، ممکن کہ ایک نسخہ ایک مرض کے لیے تم نے فصول مختلفہ بلاد متعددہ واعمار متفاوتہ وامزجۂ متباینہ میں تجربہ کیا اور ہمیشہ ٹھیک اترا، مگر وہ مرض ساج تھا یا کسی ایسے مریض کے ساتھ جسے یہ مضر نہ تھا۔ اب جس شخص کو دیر سے ہو اس میں اسی مرض سے مرکب ہو جس کے خلاف تو ضرر دے گا اور وہ تجربہ صد سالہ لغو ہو جائے گا۔

اعلیٰ حضرت آگے زائد سات نکات اور بیان کرتے ہیں۔ بخوف طوالت ملخصاً پیش کیے جارہے ہیں، لکھتے ہیں:

۵۔ نبض، قارورہ وغیرہ تمام طرق تشخیص کو عمل میں لاؤ اور ہر وقت اپنے علم وفہم وحول وقوت سے بری ہو کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں التجا کرو کہ القائے حق فرمائے۔ یہی جالب شفا ہوتے ہیں۔

۶۔ ہلکے سے ہلکے مرض کو آسان سمجھ کر تشخیص و معالجہ میں سہل انگاری نہ کرو۔

۷۔ صرف مریض یا اس کے تیماردار کے بتائے ہوئے حال پر قناعت نہ کرو اور بے تشخیص مرض کا

فیصلہ نہ کرو۔

۸۔دوا کی تمام تراکیب،طریقہ اصلاح واستعمال خوب سمجھا کر ہر مریض سے بیان کرو۔

۹۔طبیب پر اہم واجبات سے ہے کہ نیک خلق ہو،شیریں زبان،متواضع اور حکیم مہربان ہو۔

طبیب کی مہربانی وشیریں زبانی مریض کا آدھا مرض کھودیتی ہے...... نیک نیتی سے خدا بھی راضی ہوتا ہے جو خاص جالب دست شفا ہے۔

۱۰۔مرض معمولی ہو یا دشوار،مریض کو ہمیشہ بکشادہ پیشانی تکسین وتسلی دی جائے کہ کوئی بات نہیں ان شاء اللہ اچھے ہو جاؤ گے۔

۱۱۔علاج بعد تشخیص ہونا چاہیے نہ کہ تشخیص بعد علاج!......

طبیب کے لیے طبی بصیرت لازمی ہے:

طبی بصیرت کے بغیر کوئی شخص ماہر فن طب وحکمت نہیں تسلیم کیا جاسکتا ہے اور طبی بصیرت سے مراد ہے علم طب میں کام لیے جانے والے سائنسی علوم مثل طبعیات، کیمیا، ارضیات، حیاتیات اور نباتات وغیرہ سے طبیب کو آگاہی ہو، کیوں کہ مرض کی تشخیص سے لیکر دواسازی اور دواؤں کی تجویز (مریض کی جسمانی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے) نیز ان کے ایسے اثرات کہ جس سے مریض کو جلد اور فوری طور سے شفاوصحت ہو۔

جہاں تک امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کی طبی بصیرت یعنی مذکورہ بالا سائنسی علوم سے آپ کی واقفیت یا آگاہی کا تعلق ہے،تو حقیقت یہ ہے کہ آپ کو ان علوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔

فتاویٰ رضویہ جلد اول میں تیمم کے مسائل بیان کرتے ہوئے امام احمد رضا نے جنس ارض کی جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے علم کیمیا اور ارضیات کی برانچ حجریات میں آپ کی مہارت بلکہ محققانہ مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔اسی تعلق سے امام احمد رضا کی طبی بصیرت کو اجاگر کرتے ہوئے حکیم محمد سعید دہلوی جیسے طبیب کامل لکھتے ہیں:

"فاضل بریلوی کے فتاویٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ احکام کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے سائنس اور طب کے تمام وسائل سے کام لیتے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ کس لفظ کی معنویت کی تحقیق کے لیے کن علمی مصادر کی طرف رجوع کرنا چاہیے اس لیے ان کے فتاوے میں بہت سے علوم کے نکات ملتے ہیں، مگر طب اور اس علم کے دیگر شعبے مثلاً علم کیمیا اور علم الاحجار کو تقدم حاصل ہے اور جس وسعت کے ساتھ اس علم کے حوالے ان کے ہاں ملتے ہیں، اس سے ان کی دقت نظر اور طبی

بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں صرف ایک مفتی نہیں بلکہ محقق طبیب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اس تحقیقی اسلوب ومعیار دین وطب کے باہمی تعلق کی بھی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے (مضمون۔امام احمد رضا کی طبی بصیرت مشمولہ معارف رضا، کراچی، شمارہ نہم ۱۹۸۹ء ص ۱۱۰)

جذام اور طاعون متعدی امراض نہیں!

امام احمد رضا کے نزدیک جذام متعدی مرض نہیں ہے اور نہ ہی طاعون۔

امام احمد رضا سے عرض کیا گیا ''بعض مرض متعدی ہوتے ہیں؟

جواب دیا ''نہیں! حدیث میں ارشاد ہوا لا عدوی۔

عرض: پھر جذام سے بھاگنے کا کیوں حکم دیا گیا؟

ارشاد: وہ حکم ضعیف الایمان کے واسطے ہے کہ اگر وہ اس کے پاس بیٹھے اور تقدیر الٰہی سے کچھ ہوجائے تو شیطان بہکادے گا کہ یہ اس کے پاس بیٹھنے سے ہوگیا گر نہ بیٹھتا تو نہ ہوتا تقدیر الٰہی کو بھول جائے گا۔

پھر امام احمد رضا سے عرض کیا گیا: ''پھر طاعون سے بھاگنے کی ممانعت کیوں؟

جواب دیا ''اس کے لیے حدیث میں صاف ارشاد ہے: **الفار من الطاعون کالفار من الزحف۔** طاعون سے بھاگنے والا ایسا ہی ہے جیسا جہاد میں کفار کو پیٹھ دے کر بھاگنے والا۔ اس پر بھی یہی ارشاد ہوا کہ جہاں طاعون ہو وہاں بلا ضرورت نہ جاؤ۔ (الملفوظ مرتبہ مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خاں۔ص ۷۷ مطبوعہ دہلی)

عام طور سے حکماء اور ڈاکٹر صاحبان تو سب کے سب جذام اور طاعون کو متعدی امراض مانتے ہیں لیکن امام احمد رضا نے احادیث کریمہ سے دلیل دی کہ یہ امراض متعدی نہیں ہیں۔ احادیث کا علم اور سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان اٹل ہے اور طبابت ومیڈیکل سائنس کے علوم ونظریات تجرباتی مراحل سے گزرتے رہتے ہیں، یعنی خطا واقدام کے مراحل سے۔

امام احمد رضا نے ہر علم کے اصول ونظریہ کو قرآن وسنت ہی کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور آپ کو انہیں کی بدولت طبی وسائنسی ودیگر علوم کی بصیرت حاصل ہوئی ہے۔

منہ کی گلٹیاں کالی مرچ سے اچھی ہوگئیں:

کسی وجہ سے امام احمد رضا کے منہ میں گلٹیں نکل آئیں تھیں۔ طبیب نے بتایا کہ طاعون ہے، لیکن آپ نے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعا پڑھ لی تھی لہٰذا یقین کامل تھا کہ طاعون کا مرض آپ کو نہیں ہوسکتا۔ آپ نے گول مرچ کو مسواک پر رکھ کر مسواک کیا تو ایک کلی خون کی آئی، مگر تکلیف نہ

ہوئی۔ بعدہ دوسری کلی خون کی آئی اور گلٹیں جاتی رہیں اور آپ کا منہ کھل گیا۔

گول مرچ سے مسواک کرنے کا امام احمد رضا کو غیبی اشارہ ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک طبی نسخہ بن گیا اور اسے ''نسخہ رضویہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ (ایضاً حصہ اول ص ۴۹)

امام احمد رضا بہت سے امراض کی باریکیوں سے واقف تھے اور انہیں یہ واقفیت حدیث پاک کے علم کی بدولت ہوئی تھی، ارشاد فرماتے ہیں:

۱- زکام کہ اس کی وجہ سے دماغ کی بہت سی بیماریوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

۲- کھجلی کہ اس سے امراض جلد یہ جذام وغیرہ کا انسداد ہو جاتا ہے۔

۳- آشوب چشم نابینائی کو دفع کرتا ہے۔ (ایضاً حصہ اول ص ۴۷)

نسخہ سازی: امام احمد رضا کے مریدین ومعتقدین اپنی بیماریوں میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ صرف ان کے مکتوبات میں ان کے لکھے ہوئے حالات کو مدنظر رکھ کر انہیں نسخہ لکھ کر ارسال فرماتے تھے۔

مولانا عرفان علی صاحب بیسل پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ عنہ نے ان کے خط میں لکھے ہوئے حالات اور بیماری کے مدنظر دو نسخے ارسال فرمائے۔

۱۔ نسخہ حب جواہر...... برائے مقوی روح ومقوی قلب

یاقوت رمانی۔ ۳ مثقال، عقیق یمنی۔ ایک مثقال، یشف سفید۔ یک نیم مثقال، زہر مہرہ مثقال۔ ۲ مثقال، ورق طلا۔ ایک مثقال۔

درگلاب سرمہ سائدہ حب برابر نخو دوانہ خوراک یک ماشہ حب۔

(ایک مثقال ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے)

۲۔ نسخہ قہوۂ مقوی معدہ وجگر ودماغ ومشتہی

پودینہ خشک۔ ۵ ماشہ، دار چینی۔ (۱/۲) ماشہ، قرنفل۔ ۵ عدد، الائچی سفید جوکوب۔ ۲ ماشہ، انیسون۔ ۳ ماشہ، گاؤزبان گیلانی۔ ۳ ماشہ، بادرنجبویہ۔ ۳ ماشہ، مویز منقیٰ۔ ۱۰، دانہ عودغرقی۔ ۳ سرخ، نبات سفید، ۲ تولہ، مشک۔ برنج، گلاب عمدہ۔ ۳ تولہ، مجموعہ ایک خوراک ہے۔ چائے کی طرح روزانہ پئیں۔ حسب مزاج ان دواؤں میں کمی بیشی کر سکتے ہیں (مکتوب بنام مولوی عرفان علی بیسلپوری مشمولہ حیات اعلیٰ حضرت)

علم الابدان Eonbryology

ایکسرے مشین (X-Ray Machine) کے موجد جرمن سائنس دان کو اس کی ایجاد پر ۱۹۰۱ء میں نوبل پرائز (Nobel Prize) دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ایجاد تھی۔ اب اس میں مزید اصلاح کے بعد الٹرا ساؤنڈ (Altra Sound) کا طریقہ اپنایا جانے لگا ہے اور پھر یہ دعویٰ کیا جانے لگا ہے کہ اس کے ذریعہ جنینز کے ساتھ جنس ابھرنے کے بعد اس کی جنس نوع کا پتہ چل جاتا ہے یعنی چار ماہی حمل کی ذکورت وانا ثت کا پتہ چل جاتا ہے۔ پادریوں نے اس آلہ کی وجہ سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کے قرآن میں ہے کہ پیٹ کا حال کوئی نہیں جانتا کہ بچہ ذکور ہے یا اناث لیکن ہم نے ایک ایسا آلہ نکالا ہے جس سے پورا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

اس مسئلہ کو لے کر مولانا عبد الوحید صاحب فردوسی عظیم آبادی نے امام احمد رضا سے استفتا کیا تو جواب میں امام احمد رضا نے ایک معرکہ آرا رسالہ بنام ''الصمصام علی مشکک فی آیت علوم الارحام'' (۱۸۹۵ء/۱۳۱۴ھ) لکھا۔

زیرِ نظر رسالہ میں امام احمد رضا نے فقہ، تفسیر، حدیث، علم کلام و دیگر دینی علوم وفنون کے علاوہ علم طبعیات، ہیئت ونجوم اور علم الحیوانات نیز میڈیکل سائنس وغیرہ میں اپنی مہارت کا زبردست مظاہرہ فرمایا ہے۔

امام احمد رضا نے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ آیات قرآنی میں جس علم کو اللہ عزوجل سے خاص بتایا گیا ہے، وہ کسی مخلوق کے لیے ممکن نہیں، پھر انسانی علم کی حقیقت بیان کر کے اس آلہ سے ثابت ہونے والے علم کی کیفیت سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ علم باری تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا جائز نہیں، لہٰذا آلہ سے یا خود انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کو خاص واجب سے اختصاص نہیں اور جو واجب کے ساتھ خاص ہے، وہ انسان اور آلہ کے لیے ثابت ہونا ممکن نہیں، لہٰذا قرآنی آیت بے غبار، قرآن کا اعلان برقرار اور یہ شبہات بے اعتبار!

اب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اس آلہ کی بابت گفتگو فرماتے ہیں:

''اب اس آلہ محدثہ کی طرف چلیے۔ فقیر اس پر مطلع نہ ہوا نہ کسی سے اس کا حال سنا۔ ظاہر ایسی صورت نہیں کہ جن میں بحال وفی ظلمات ثلاث، تین اندھیریوں میں رہے اور بذریعہ آلہ مشہود ہو جائے اور اس کا جسم بالتفصیل آنکھوں سے نظر آجائے کہ بعد میں علوق فم رحم سخت منضم ہو جاتا ہے جس میں میل سرمہ بدقت جائے، اور اس جائے تنگ وتار میں جنین محبوس ہو جاتا ہے وہ بھی یوں نہیں بلکہ اس پر تین اور

غلاف چڑھے ہوتے ہیں، ایک غطائے رقیق ملاقی جسم مبین جس میں اس کا فضلۂ عرق جمع ہوا ہے اس پر ایک اور حجاب اس سے کثیف ترمسمیٰ بہ غشائے لفافی جس میں فضلۂ بول مجتمع رہتا ہے اس پر ایک اور غلاف اکثف کہ سکو محیث ہے جسے شیمہ کہتے ہیں۔ ایسی حلاتوں میں بدن نظر آنے کا کیا محل ہے تو ظاہراً آلے کا محصل صرف بعض علامات وامارات ممیّزہ منجملۂ خواص خارجیہ کا بتانا ہوگا جن سے ذکورت وانا ثت کا قیاس ہوسکے جیسے رحم کی کی تجویف ایمن یا ایسر میں حمل کا ہونا یا اور بعض تجربات کہ تازہ حاصل کیے گئے ہوں اگر اسی قدر ہے جب تو کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی مجربین قیاسات فارقہ رکھتے تھے جیسے دہنی یا بائیں طرف جنین کی پیشتر جنبش یا حاملہ کی پستان راست یا چپ کے حجم میں افزائش یا سرہائے پستان میں سرخی یا ادواہٹ آنا یا رنگ روئے زن پر شادابی یا تیرگی چھانا یا حرکات زن میں خفت یا ثقل پانا، قارورے میں اکثر اوقات حمرت یا بیاض غالب رہنی یا عورت کے خلاف عادت بعض اطعمۂ جیدہ یا رویہ کی رغبت ہوتی یا شم کبود میں زراوندہ مدقوق بعسل سرشتہ کا صبح علی اریق حمول اور ظہر تک مثل صائم رہ کر مزۂ دہن کا امتحان کہ شیریں ہوا یا تلک الیٰ غیر ذلک مما یعرفه اهل الفن ولكل شروعط براعیها البصیر فیصیب الظن. (اصمصام علیٰ مشک فی آیة علوم الارحام)

مندرجہ بالا عبارت سے امام احمد رضا کی علم الابدان اور مخصوص طب نویسی کی اصطلاح سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر طبیب بھی تھے یا آج کی اصطلاح میں کہیں تو وہ ایک ماہر فزیشن (Physician) اور ماہر سرجن (Surgeon) تھے۔

امام احمد رضا نے جہاں یہ بتایا ہے کہ قیاسات کے تجربہ کار (دوائیاں ہوں یا اطبا وغیرہ) وہ حاملہ عورت کی جسمانی تبدیلی، قارورہ کی رنگت اور چہرے کی شادابی و تیرگی وغیرہ سے یہ قیاس ضرور لگالیتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں کیا ہے؟ لڑکا یا لڑکی! علاوہ اس کے خود ایک طبی عمل بھی بتاتے ہیں کہ اس سے بھی ذکورت یا انا ثت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے: ''چشم کبود میں زاراوند قوق بعسل سرشتہ کا صبح علی الریق حمول اور ظہر تک مثل صائم رہ کر مزہ دہن کا امتحان کہ شیریں ہو یا تلخ''۔

اب آگے امام احمد رضا جنین کے مشاہدے کے قیاسات اور مخصوص طبی عمل وغیرہ کے بعد اس آلہ کے قیاس اور اس کی بناوٹ کے اعتبار سے اس طرح فرماتے ہیں:

''اور عجائب صنع الٰہی جلت حکمتہ سے یہ بھی متحمل کہ کچھ ایسی تدابیر القا فرمائی ہوں کہ جن سے جنین مشاہدہ ہوجاتا ہو، مثلاً بذریعہ قواسر پانچوں حجابوں میں بقدر حاجت کچھ توسیع وتفریح دیگر روشنی پہنچا کر شیشے ایسی اوضاع پر لگائیں کہ باہم تادیۂ عکوس کرتے ہوئے زجاج عقرب پر عکس لے آئیں یا

زجاجات متخالفۃ الملاء میں ایسی وضعیں پائیں کہ اشعۂ بصریہ کو حسب قاعدہ معروضہ علم مناظر، انعطاف دیتے ہوئے جنین تک لے جائیں۔'' (الصمصام علی مشکک فی آیۃ علوم الارحام)

مندرجہ بالا عبارت علم طبعیات کی برانچ روشنی یا نور (Optics یا Light) میں مہارت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ امام احمد رضا نے واضح کردیا ہے کہ مشینی طریقے سے اگر جنین مشاہدہ ہی ہوجاتا ہے، تو معاذ اللہ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم حقیقی وذاتی پر حرف نہیں آتا۔ امام احمد رضا نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اس آلہ میں اصل کام علم طبعیات کے علم المناظر والمرایا سے لیا گیا ہے اور اس کا فیصلہ یقینی بدیہی نہیں۔

الٹرا ساؤنڈ سے چند علامات ایسی ظاہر ہوتی ہیں کہ جن سے ذکورت یا اناثت کا قیاس لگالیتے ہیں۔ ہندوستانی کورٹ نے الٹرا ساؤنڈ سے جنین کی جانچ پر پابندی لگادی ہے اور سزا بھی مقرر کردی ہے۔ اس آلہ کی تشخیصات کو اس فن کے ماہرین تقریبی تشخیص قرار دیتے ہیں۔ یقینی اور حتمی نہیں مانتے۔

عرض مدعا یہ کہ امام احمد رضا طب وحکمت کی تمام باریکیوں سے خوب واقف تھے اور وہ زبردست طبی اور سائنسی بصیرت کے مالک تھے۔

روداد و قرارداد

امام احمد رضا سمینار و کانفرنس ممبئی کے انعقاد پر اس کے کنوینر

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی سے ایک گفتگو

گفتگو: عتیق الرحمٰن رضوی، سکریٹری نوری مشن مالیگاؤں

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی (ممبئی) علمی، دینی و ادبی دنیا میں اعتبار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلند پایہ مصنف اور سنجیدہ اسلوب کے دانش ور ہیں۔ اب تک دسیوں کتابیں اور درجنوں مقالات تحریر کر چکے ہیں، موصوف کو دینی و ادبی حلقوں سے کئی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے، جن میں نمایاں ایوارڈ ''امام احمد رضا ریسرچ ایوارڈ گولڈ میڈل'' ہے۔ جسے ان کی رضویات کے موضوع پر خدمات کے اعتراف میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے دیا اور دوسرا جہان ملک العلما کی ترتیب پر ''ملک العلما ایوارڈ'' جو انتہائی قلیل مدت میں جہان ملک العلما جیسی عظیم الشان کتاب کی تیاری پر ملا...... ان دنوں ڈاکٹر صاحب قومی سطح پر ایک روزہ امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس کا انعقاد ۷ر فروری ۲۰۱۰ء کو ممبئی میں کر رہے ہیں، جس کے لیے موصوف نے اپنے شب و روز وقف کر رکھے ہیں۔ موصوف نے روایت سے ہٹ کر ملک کی مشہور و معروف یونی ورسٹیوں اور جامعات کے پروفیسرز، ادبا، دانش وروں اور ہیڈ آف ڈپارٹ منٹ کو مدعو کیا ہے اور امام احمد رضا کی دینی، سماجی، اصلاحی، معاشی، سائنسی، طبی اور فکری تحریکات پر مقالے لکھوا رہے ہیں۔ کانفرنس کے پیش نظر ان سے لیا گیا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ نے امام احمد رضا پر تحریر کا آغاز کب کیا؟

جواب: ۱۹۸۹ء میں جب میں مبارک پور اشرفیہ میں زیر تعلیم تھا۔

سوال: سیمینار و کانفرنس سے ہٹ کر کیا آپ کے ذہن میں کوئی تعلیمی منصوبہ بھی ہے، جہاں سے فروغ رضویات کو توانائی ملے؟

جواب: جی ہاں! میرا ایک خواب ہے۔ پتا نہیں کب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ

میں ایک کم گو، کم آمیز آدمی ہوں، عوامی رابطہ بالکل نہیں، کسی تعلیمی منصوبے کو بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، سرمایہ فراہم کرنا ایک فن ہے، جس سے میں بالکل نابلد اور کورا ہوں، خدا کی ذات سے امید ہے کہ میرا خواب تعلیمی سطح پر ذہن سے زمین پر ضرور اترے گا، غیب سے وسائل پیدا ہوں گے اور یہ منصوبہ نمونے کی شکل میں نمودار ہوگا۔

سوال: جیسا کہ آپ نے کہا کسی تعلیمی منصوبے پر کام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ضمناً ایک سوال کروں گا کہ نصاب تعلیم میں رضویات پر مواد کی شمولیت کے لیے کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب: اردو زبان کی پیدائش و پرورش حق یہ ہے کہ صوفیا و علما کی ہی گود میں ہوئی، یہ وہ حقیقت ہے، جس کا انکار شاید ہی کوئی کر سکے، اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں آج اردو ادب کا جو حصہ شامل ہے، اس میں صوفیا و علما کی کوئی شمولیت نہیں، یہ ایک باعث تعجب امر ہے۔ امام احمد رضا جو اپنے دور میں سب سے زیادہ نظم و نثر میں لکھنے والے ممتاز مصنف تھے، ان کی تصانیف جو کمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے بلند و بالا ہے، بقول سید محمد اشرف مارہروی ''امام احمد رضا کے شعری و نثری سرمائے میں اردو ادب کا وہ طنطنہ موجود ہے، جن سے خاصان ادب کے دامن خالی نظر آتے ہیں۔''

حیرت ہے ادبی حلقوں نے اس طرف اپنی توجہ کیوں مبذول نہیں کی، پڑوسی ملک پاکستان میں جا بجا امام احمد رضا کی ذات و افکار کا مطالعہ شامل نصاب ہے، ہندوستان میں بھی دو چار جگہوں پر داخل نصاب کیا گیا ہے۔ ہم اس سیمینار کے پلیٹ فارم سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جدید دانش کدوں میں صوفیائے کرام خصوصاً امام احمد رضا کی تصانیف و تحقیقات کو شامل نصاب کیا جائے، یہ مشکل کام ہے مگر ناممکن نہیں، اس کے لیے ماہرین تعلیم اور نصاب ساز کمیٹی کے ارباب حل و عقد سے سفارش کی جائے گی کہ وہ افکار امام احمد رضا کے منتخبات و مختصرات کو شامل نصاب کریں، اس کے لیے وقت درکار ہوگا اور تعلیم و تدریس سے جڑے افراد کو مسلسل اس مطالبہ کو منوانے کی کوشش کرنا ہوگی۔

سوال: ابھی آپ نے کچھ لمحہ پہلے کسی منصوبے کی بات کی تھی، کیا تفصیل بتانا پسند کریں گے؟

جواب: قبل از وقت واویلا مچانا میری عادت نہیں، جب ایجوکیشنل پروجیکٹ شروع ہوگا، تو

لوگ خود جان جائیں گے اور وہ ایجوکیشنل پروجیکٹ بھی رضویات کے فروغ کے لیے ایک پل کا کام کرے گا۔

سوال: کانفرنس کے انعقاد سے فروغ رضویات میں کیا فائدے حاصل ہوں گے؟

جواب: یوں تو آج کل ہر جلسہ کو کانفرنس، ہر مدرسہ کو یونی ورسٹی اور ہر مولوی کو علامہ کہنے کی ایک روایت سی بن گئی ہے، لیکن اس امام احمد رضا کانفرنس کی نوعیت بالکل روایت سے ہٹ کر ہے، یہ پروگرام جو دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ بنام سیمینار ہے، جو خالص علمی نہج اکیڈمک لیول پر ہوگا، جس میں ملک کے منتخب اہل قلم، اصحاب علم و دانش، امام احمد رضا کی شخصیت، سیرت، افکار، نگارشات، نظریات کا خالص علمی انداز میں تجزیہ کریں گے، سامعین جن کی اکثریت بہ ذات خود حلقۂ علم و دانش سے ہوگی، جس سے سامعین کی معلومات میں ایک اہم اضافہ ہوگا، ان شاء اللہ۔ یہ تو رہی خالص علمی مذاکرے کی بات، لیکن یہ کانفرنس جیسا کہ میں نے کہا کہ دیگر کانفرنسوں سے ہٹ کر ہوگی، یہ اجلاس عام بھی خالص علمی نوعیت کا ہوگا۔ پامال موضوعات سے الگ مقررین کو دیے گئے موضوعات کے دائرہ میں رہ کر گفتگو کرنا ہوگی، جس کی روشنی میں ہمارے سامعین بہ آسانی یہ فیصلہ کریں گے کہ واقعی یہ کانفرنس علمی اور بامقصد ہے، نئی نسل، نوجوانوں میں کام کرنے کی امنگ پیدا ہوگی، غلط فہمیوں کے شکار افراد کو اپنی رائے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی اور پھر یہ کہ ممبئی اور اطراف ممبئی مثلاً بھیونڈی، کلیان، تھانہ، ناسک، مالیگاؤں، پونے وغیرہ سے افراد شریک ہوں گے، جو سماجی، سیاسی، فلاحی خدمات، تعلیمی شعبے، اخبارات کے نمائندے، اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طلبا پر مشتمل ہوں گے۔

سوال: اتنے دانش وروں کے جمع ہونے پر مستقبل کے لیے کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے گا؟

جواب: یہ سچ ہے کہ یہ پہلا موقع ہے، ہندوستان کی تاریخ میں امام احمد رضا کی شخصیت وعلمیت کو سمجھنے کے لیے ملک کی مشہور یونی ورسٹیوں سے اتنی بڑی تعداد میں دانش وروں کو جمع کیا جارہا ہے، بلکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے بھی بہت بھاری تعداد دانش وروں کی ہی ہوگی، ان کی تحریر و تقریر، خطابت وسماعت کے نتیجے میں یہ لائحۂ عمل مرتب کیا جائے گا کہ مستقبل میں دانش ورانہ سطح پر کس نہج سے کام ہوگا۔

سوال: امام احمد رضا پر اتنے عظیم پیمانے پر کانفرنس منعقد کرنے کا خیال کیوں کر آیا؟

جواب: میری افتادِ طبع عجب سانچے میں ڈھلی ہے، اسے دانش مندی کہیے یا حماقت، لوگ منجدھار سے بچتے ہیں، میں منجدھار سے کھیلتا ہوں۔ آپس میں پنجہ آزمائی یا پنگا بازی آسان ہے، مشکلات سے پنگا لینا ایک مشکل معاملہ ہے، میں دیکھ رہا ہوں، ہمارے یہاں جلسے جلوس کا جو رواج ہے وہ خالص عوامی ہے، میں اس کی افادیت کا منکر نہیں، مگر خالص علمی نہج کا کوئی مذاکرہ، مکالمہ، مباحثہ، سیمینار، سمپوزیم، ورک شاپ کا انعقاد شاید و باید ہی ہوتا ہے، جس سے علمی و ادبی حلقوں اور دانش کدوں میں افکار امام احمد رضا کو ہمہ گیر عالمی اہمیت کے تناظر میں پیش کیا جاسکے، اس گھپ اندھیرے میں جگنو کا حوصلہ لے کر یہ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے، جس سے امام احمد رضا کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کا ہمہ جہت تجزیہ کرتے ہوئے اس کی اہمیت و معنویت کو اُجاگر کیا جائے گا، اسی مقصد کے تحت اس پروگرام کا تخیل ذہن کے کینوس پر ابھرا اور تنہا ہی چل پڑا، پھر لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ممبئی اور اطراف ممبئی، تھانے، بھیونڈی، کلیان، سورت، ناسک اور پونے تک کے جوانوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا ہو چکی ہے۔

سوال: فروغ رضویات کے لیے موثر انداز میں کام کرنے کے لیے کیا تدبیریں ہوسکتی ہیں۔

جواب: یہ ایک ایسا سوال ہے، جس میں بہت وسعت ہے، بولوں تو دفتر ہو لکھوں تو داستان بنے، سر دست فروغ رضویات، تفہیم رضویات، اور رضا شناسی کے لیے جو تدبیریں اپنائی جارہی ہیں، وہ اپنی جگہ، مگر تفہیم رضویات کی ایک شکل طلبا میں کارنر میٹنگ، لائبریریوں، ادبی کلبوں، علمی حلقوں، جدید دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبا میں امام احمد رضا پر خصوصی لیکچرز کا اہتمام کیا جائے، ان میں آسان مفید لٹریچر کی اشاعت کی جائے، اس کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے جب ماہ صفر کا چاند نمودار ہو۔ مقامی، ضلعی، صوبائی، ملکی سطح پر اپنی حد اور بساط کے مطابق چھوٹے بڑے پیمانے پر عوامی جلسے منعقد کیے جائیں، سیمینار، سمپوزیم، ورک شاپ، علمی مذاکرے، مباحثے، کوئز کمپٹیشن، تحریری و تقریری انعامی مقابلہ برپا کیا جائے۔ ہر مسجد، ہر مدرسہ، ہر خانقاہ، یوم رضا، یاد رضا، ذکر رضا، جشن رضا منائے۔ مخلص کارکنان، ذہن ساز افراد، کامیاب مندوبین کے درمیان انعامات، اعزازات، ٹروفیاں، شیلڈ، کتابی تحفے تقسیم کیے جائیں۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اہل سنت کے جتنے رسالے اور جریدے ہیں، وہ سب ماہ صفر میں رضویات پر خصوصی شمارے شایع کریں،

اس کی تیاری ذرا پہلے ہی سے کریں تاکہ مکررات نہ آنے پائیں، منفرد موضوعات کا انتخاب کریں اور وہ ملک بھر کی لائب ریریوں، اکیڈمیوں، کونسلوں، ادبی ایوانوں، اور تحقیقی مراکز تک پہنچائے جائیں، نیز دہلی، ممبئی، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ، حیدرآباد، بنگلور جیسے شہروں سے شایع ہونے والے بڑے اخبارات کو مواد و معلومات فراہم کر کے ان کی خصوصی اشاعتیں کروائی جائیں۔ یہ اشاعتیں اردو کے علاوہ ہندی و انگریزی میں بھی بہ طورِ خاص عمل پذیر ہوں، زیادہ نہیں صرف پانچ برسوں میں ایک نیا علمی انقلاب رونما ہوگا اور افکارِ رضا کی ملکی و عالمی اہمیت و معنویت واضح ہو کر سامنے آئے گی۔

سوال: یہ تو ایک بیداری مہم کا بڑا منصوبہ ہے، اس کے لیے کثیر سرمایہ چاہیے۔ یہ بوجھ یا جوکھم کون اٹھائے؟

جواب: دیکھیے، کوئی بھی چیز اچانک تحریک نہیں بن جاتی، تحریک تو تیسری منزل ہے۔ پہلے ذہن میں تصور یا تخیل ابھرتا ہے، پھر وہ تخیل رجحان بنتا ہے۔ یہی رجحان جب عوامی چیز یا عوامی زور بن کر ابھرتا ہے، تو وہی عوامی چیز، عوامی زور یا عوامی رجحان بہاؤ، چلاؤ کی تصورات میں ڈھل کر تحریک بن جاتا ہے۔ تو پہلی منزل ہے، کسی بھی خیال یا تصور کو عوامی چیز بنا دینا، یہی مرحلہ مشکل ترین ہے۔ جب یہ کٹھن مرحلہ عبور کر لیا جائے گا۔ تو رجحان خود بخود پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ یوں جب رجحان جسے ذہنی جھکاؤ بھی کہہ سکتے ہیں بن گیا، تو یہی رجحان اپنے بطن سے تحریک کو جنم دے دے گا۔ تخیل سے تحریک تک کا یہ سفر یک روزہ، دو روزہ نہیں ہے۔ یہ سفر کم سے کم پنج سالہ، زیادہ سے زیادہ دس سالہ مدت چاہتا ہے۔ رہی بات یہ کہ یہ جوکھم کون اٹھائے، اول تو یہ اقدام خود خانوادۂ رضویہ کی طرف سے ہونا چاہیے۔ صاحب سجادہ حضرت سبحانی میاں، جانشین مفتی اعظم حضرت ازہری میاں چاہ لیں، تو یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ پھر تو دوسرے خربوزے خود بہ خود رنگ پکڑتے چلے جائیں گے ثانیاً امام احمد رضا اکیڈمی بریلی، رضا اکیڈمی ممبئی، امام احمد رضا اکیڈمی کلکتہ کرے۔ المجمع الاسلامی مبارک پور، دار القلم دہلی بھی یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے۔ اس کام کے لیے مرکزی مجلس رضا لاہور کا پرانا ڈھانچہ، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی کا موجود ڈھانچہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اب رہی بات کثیر سرمایہ داری، تو ہر چند کہ سرمایہ میں بڑی طاقت ہے، لیکن سرمایہ ہی سب کچھ نہیں

ہے۔عزم وارادہ اور چاہت وکوشش بھی کوئی چیز ہے۔میرے نزدیک سرمایہ سے زیادہ عزم وعمل کی طاقت ہے۔عزم وعمل خود ہی سرمایہ فراہم کرلیتا ہے۔البتہ شرط یہ ہے کہ آپ کے عزم وعمل کے جوڑ جوڑ، پور پور میں اخلاص، ایثار، فدائیت، جنونیت کا گرم لہو رقصاں ہو۔

سوال: آخری سوال یہ ہے کہ فروغ رضویات کے لیے کانفرنس کے توسط سے آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب: اس کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یہ پیغام نشر کیا جائے گا کہ یاروں نے نہر کو بحر، کنواں کو دریا بنادیا اور دنیا نے باور کرلیا کہ ملک وملت کے مخلصین یہی تھے، جب کہ امر اس کے برعکس ہے، یہ ہماری غفلت، سستی، تساہلی، جمود، بے حسی، بے بصری، بے بصیرتی کا نتیجہ ہے، امام احمد رضا جو بحر تھے، جو دریا تھے، ہم نے نہر اور کنویں کی شکل میں پیش کیا، اس کانفرنس سے رضویات کو وہی بحر میں دریا کی شکل میں پیش کرنے کی اور حق کو حق کہنے کی تحریک پیدا کی جائے گی، تاکہ دنیا امام احمد رضا کے علم وفن کے جوبن کا تماشا دیکھے۔

امام احمد رضا کانفرنس و سمینار: عزم سے تکمیل تک

(منعقدہ ۷؍فروری ۲۰۱۰ء میرا روڈ ممبئی)

عتیق الرحمٰن رضوی، رکن نوری مشن کے مشاہداتی قلم سے......

آئینہ:

بیسویں صدی عیسوی میں دینی خدمت، علمی کارنامے، فقہی مہارت، سماجی بصیرت، سائنسی زکاوت اور جدید وقدیم علوم وفنون پر دسترس کے لحاظ سے امام احمد رضا کی ذات نمایاں، منفرد اور یکتائے روزگار ہے...... مسلم دنیا آپ کی ذات پر فخر کرے تو بجا ہے۔

امام احمد رضا محدث بریلوی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں بریلی کی سرزمین پر پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں وصال فرمایا...... آپ کی بے مثال خدمات اور تحقیقاتِ علمیہ سے اُمت مسلمہ کو باخبر کرنے کی غرض سے سرزمین میرا روڈ ممبئی میں ایک عظیم الشان منفرد المثال ''امام احمد رضا کانفرنس و سمینار'' کے انعقاد کا منصوبہ تیار کیا گیا...... اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے خلوص وللّٰہیت کے ساتھ کام کا آغاز کیا...... آغاز کیسے ہوا...... سفر کی کیفیت کیسی رہی...... رفتار کا کیا عالم رہا...... منزل تک رسائی کن مرحلوں سے گزر کر ہوئی...... کیا کیا مراحل درپیش آئے...... فکر رضا، فیض رضا، عنایت رضا نے کس طرح سنبھالا دیا...... اوراق الٹیے اور عزم سے تکمیل تک کے سفر میں ساتھ ساتھ چلیے......

☆☆☆
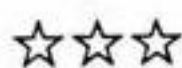
آغاز: (۲۴؍دسمبر ۲۰۰۹ء)

☆...... ملک کے تقریباً ۲۰۰؍نامور اداروں، مدارس، یونی ورسٹیوں اور مشاہیر علما و دانش وروں کو اعلانیہ پوسٹر کی فراہمی۔

☆...... ممبئی اور اطراف ممبئی میں مشہور جگہوں اور شاہراہوں پر پوسٹر چسپاں کیے گئے۔

☆...... بینرز اور جھنڈوں کی تیاری۔

☆......مختلف ذرائع (مثلاً e-mail,SMS,Cell. وغیرہ) سے عوام الناس کو پروگرام کی اطلاع پہنچانا اور کانفرنس کی افادیت سے آگاہ کرنا۔

☆......۲۵؍دسمبر ۲۰۰۹ء کو جناب محمد طاہر اشرفی کی آمد ہوئی جنھوں نے اپنے قیمتی مشوروں اور مفید آرا سے نوازا۔ موصوف کی شخصیت سیاسی وسماجی اور فلاحی لحاظ سے اعتبار کا درجہ رکھتی ہے......اس سے قبل مختلف مقامات پر پوسٹر چسپاں کیے گئے اور میرا روڈ کی کئی مساجد میں نماز جمعہ کے بعد ہینڈ بل اور پمفلٹ کی تقسیم عمل میں آئی۔

☆......۲۶؍دسمبر کو ملاڈ کے علاقوں میں بھی پوسٹر لگائے گئے اور کئی میٹنگیں کی گئیں، جن میں قابل ذکر شخصیت مفتی محمد شعبان علی نعیمی کی ہے۔ موصوف نے پوسٹر دیکھتے ہی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا:

''یہ کوئی خدمت ہوئی۔ ہمارے علما اور مقررین حضرات تقریروں میں چند گھنٹے اور کچھ منٹ اعلیٰ حضرت کا ذکر کر کے نذرانے وصول کر لیتے ہیں۔ مگر آپ کا یہ قدم واقعی منفرد ہے، اس سے نئی نسل اور خصوصاً ایجوکیٹیڈ طبقے میں ایک اچھا تاثر قائم ہوگا۔''

اظہارِ شمس:

دورانِ گفتگو شمس مصباحی صاحب نے اپنے خیالات کا بھی اظہار فرمایا، جس میں ان کا درد، ملت کی کسک اور رضویات کے فروغ کا جذبہ عیاں تھا۔ شمس مصباحی نے کئی علمی نکات بیان کیے اور کئی نئے گوشے وا کیے، مثلاً

☆......دنیوی ماہرین معاشیات نے بینک کاری کے نظام سے متعلق ۱۹۳۶ء میں شوشہ چھوڑا، جب کہ اعلیٰ حضرت نے ۱۹۱۲ء میں مسلم بینک کاری کا راستہ بتا دیا تھا اور اس پر فکر انگیز رسالہ ''تدبیر فلاح ونجات و اصلاح'' لکھا۔

☆......موصوف نے کہا کہ فلاں پروفیسر اپنے مقالہ میں کہتے ہیں کہ ''قوم کی بنیاد وطنیت پر ہے یا مذہب پر'' یہ فلسفہ ڈاکٹر اقبال نے ۱۹۳۰ء کے بعد پیش فرمایا جب کہ امام احمد رضا ۱۹۱۹ء میں مسلم قومیت پر کتاب تحریر فرما چکے تھے جس کا نام ''المحجة المؤتمنة فی اٰية الممتحنة'' ہے۔

ایک المیہ:

موصوف نے اور بھی کئی مفید معلومات فراہم کی، فرمایا: امام احمد رضا واقعی دریا تھے، علم کا بحر

بیکراں تھے، مگر ہم نے انھیں کوزہ بنا کر پیش کیا، یہ ہماری جماعت کی بے حسی ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم نے ایک عظیم مفکر و بے مثل دانش ور کو یکسر فراموش کر دیا...... یہ کانفرنس اسی مقصد کے تحت ترتیب دی گئی ہے کہ نئی نسل اور خصوصاً معاصر دانش کدوں میں پائی جانے والی بدگمانیوں کا ازالہ ہو سکے۔

☆...... اس کے بعد پروگرام کی تشہیری سرگرمیوں کے پیش نظر ملاڈ کے ایک رنگ فروش سرفراز احمد سے ملاقات کی گئی۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے، انھوں نے پوسٹر ملاحظہ فرما کر بغیر کسی تقاضے کے خود ہی فرمایا: جھنڈوں، بینروں کے لیے جتنے کیمیکلز اور کلر کی ضرورت ہوگی، حاضر کر دوں گا۔

☆...... وہاں سے فراغت کے بعد کانفرنس آفس پہنچ کر اگلے دن کے لیے کچھ منصوبہ بندی کی۔ اور ڈاکٹر شمس محرم کی مجلس میں چلے گئے۔ راقم گھر کی سمت روانہ ہو گیا......

☆...... ۲۷ر دسمبر کو دفتری کام نمٹائے گئے اور کچھ مفید مشورے لیے گئے۔

☆...... ۲۸ر دسمبر کو اشرف الصوفیہ سے ملاقات کی، جس میں آپ نے کئی مفید مشورے دیے اور خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا۔

مولانا عبدالقادر علوی سے ملاقات:

آپ نے ڈاکٹر شمس سے متعلق فرمایا: ''ان کے کاموں سے علامہ مشتاق احمد نظامی اور علامہ ارشد القادری کی روحیں خوش ہوتی ہوں گی۔''

☆...... ۲۹ر دسمبر کو بھانڈر کے مختلف علاقوں میں تشہیری پوسٹر آویزاں کیے گیے۔

عارف نسیم خاں سے ملاقات:

آپ سے کانفرنس کے ضروری اور اہم امور پر گفتگو ہوئی، آپ نے پانچ منٹ کا وقت دیا تھا۔ لیکن جناب عارف نسیم خان وزیر حکومت مہاراشٹر ڈاکٹر غلام جابر کی گفتگو سے اتنا متاثر ہوئے کہ پونے گھنٹہ تک یہ ملاقات طویل ہوگئی۔ وزیر موصوف نے ڈاکٹر جابر شمس کے جذبات و لگن کی پذیرائی کی اور کہا کہ آپ جیسے ہیرے اب تک کہاں پوشیدہ تھے، ممبئی کے بعض علما اور پیران کرام نے سنیت کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ الا ماشاء اللہ۔ جماعت اہل سنت کو آپ جیسے قابل افراد کی ضرورت ہے۔

☆...... بعد ظہر رضا مسجد کرلا ایسٹ، مولانا نور محمد نعیم القادری، مولانا رحمت اللہ صدیقی سے ملاقات و تبادلۂ خیال ہوا۔

☆...... بعد نماز عصر مفتی زبیر احمد برکاتی، غوثیہ مسجد کرلا سے تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ان کو دعوت دینے کے

بعد وفد بھارت نگر باندرہ پہنچا۔

☆...... باندرہ میں مفتی عبد المجید صاحب سے ملاقات کی گئی اور کئی ایک مشورے ہوئے، نیز مفتی بشیر احمد حشمتی سے بھی ملاقات رہی اور پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو رہی۔

عزم کی سمت:

۳۱ر دسمبر ۲۰۰۹ء کانفرنس آفس میں میٹنگ ہوئی، جس میں کانفرنس کے تعلق سے منصوبے پیش ہوئے اور انھیں عملی جامہ پہنانے اور وسائل کے بارے میں بحث و فیصلے ہوئے۔

سنہرا موقع:

مولانا عبد القادر علوی سے ملاقات کی گئی، جس کا مقصد تیاری کی اب تک کی تفصیلات سے آگاہ کرنا تھا، آپ نے اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا اور اتنے بڑے پیمانے پر سمینار و کانفرنس منعقد کر کے سماج کے مختلف حلقوں سے مربوط افراد کو مدعو کرنے پر مبارک باد دی، فرمایا کہ آپ کے کاموں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہماری جماعت کو ایک اور پروفیسر مسعود احمد مل گیا ہو، نئی نسل اور بدگمان طبقہ تک سچائی پہنچانے کا یہ ایک سنہرا موقع ہے۔

اس کے بعد ہم لوگوں نے نماز عصر دار العلوم محبوب سبحانی میں ادا کی، پھر حاجی کلیم اللہ صاحب سے ملنے روانہ ہوئے، یہ میٹنگ بھی کافی دل چسپ رہی، سبھی حاضرین نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا، جن میں مفتی سید شاکر سیفی، مفتی زبیر مصباحی، مولانا نور محمد نعیم القادری وغیرہ بھی شریک تھے۔ میٹنگ میں شامل ایک صاحب کو یہ پسند نہ آیا کہ ہم امام احمد رضا کانفرنس و سمینار منعقد کریں اور ان کے حاسدین یا مخالفین کو بحیثیت سامع ہی سہی، مدعو کریں۔ خیر ایک لحاظ سے یہ ایک اچھا مشورہ تھا، ان کی رائے سر آنکھوں پر۔

ازالہ:

انھوں نے ہماری اصلاح فرمائی، لیکن یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے، کہ اگر ہم غیروں کو مدعو کرتے اور انھیں یہ بتاتے کہ اعلیٰ حضرت کی شان کیا تھی، ان کا علمی مقام کیا تھا، ان کی اعتقادی خدمات کیا تھیں، بعض متاثر ہوتے، بعض کی بدگمانی دور ہوتی کہ بتایا کیا گیا تھا اور صحیح کیا ہے اور وہ ہم سے قریب آتے، قبول حق کی راہ ہموار ہوتی، ہمیں اس شکوے کا موقع نہ ملتا کہ نئی نسل ہم سے دور ہو رہی ہے۔...... دوران گفتگو ایک صاحب کو اعتراض تھا انگلش اشتہار کے لفظ All Community

پر کہ آپ نے بھی قوموں کو دعوت دی ہے، یہاں بھی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ لیا جاتا تو بہتر تھا، آخر اس میں کس کا فائدہ ہے، غیر ہماری مجلس میں آکر ہماری باتیں سنیں گے، وہ بھی خالص علمی مجلس میں، اگر وہ اپنے عقائد سے باز نہیں آتے تو کم از کم اتنا اثر تو ہوگا کہ بھئی! ہم نے مولانا احمد رضا کے بارے میں جو سنا تھا، وہ اس کے برعکس ہیں، ہمیں اندھیرے میں رکھا گیا تھا، بدگمان کیا گیا تھا، تو یہ کانفرنس اس کے ازالے کا سبب بنتی، اور تاریک دلوں میں اجالے کا سبب بھی، ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہمارا کارواں قریب از منزل ہے،...... عشا کا وقت ہو چکا تھا چوں کہ میٹنگ کرلا میں تھی، اس لیے ڈاکٹر شمس باندرہ کے لیے روانہ ہوئے، جہاں ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا اور وہاں ہمیں پروگرام کی تشہیر کے لیے جانا تھا۔

دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں!:

۶ر جنوری ۲۰۱۰ء کو کرلا کے مدرسہ غوثیہ میں ایک علاقائی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس میں علاقے کی مساجد کے ائمہ، علمائے کرام شریک ہوئے اور کچھ سرکردہ افراد مدعو تھے، اس میٹنگ میں ممبئی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر صاحب علی صاحب بہ نفس نفیس شریک تھے، میٹنگ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعدۂ کلام الامام کے نغمے گنگنائے گئے، میٹنگ کے اغراض و مقاصد پر مولانا نور محمد نعیم القادری نے روشنی ڈالی، جبکہ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر غلام جابر کی خدمات کا تعارف صدر مجلس مفتی زبیر مصباحی نے فرمایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شمس نے اپنے احساسات کی ترجمانی اس شعر سے فرمائی:

کچھ اس طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اور بہت سے علمی نکات بیان کیے اور خدمات رضا کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، نگاہوں سے اوجھل تھے، یا جنھیں جان بوجھ کر چھپایا گیا تھا، آپ کے خطاب کو حاضرین نے پسند فرمایا، الغرض خدمات رضا پر جس انداز سے آپ نے روشنی ڈالی، اس سے پہلے کانوں نے ایسی گفتگو نہ سنی، اچھوتا انداز، دل میں اترنے والے نکات، آپ نے معاصرین رضا میں سرسید، ابوالکلام آزاد، اور دیگر نام نہاد مصلحین کے افکار سے امام احمد رضا کے افکار کا تقابل فرمایا اور امام احمد رضا کی عظیم فکر کی بالادستی ثابت فرمائی، جامع انداز میں گفتگو فرمائی، امام کے سیاسی، سماجی، دینی، اصلاحی افکار پر مثالوں کے ساتھ روشنی ڈالی، میٹنگ کے اختتام پر لائحۂ عمل بھی طے کیا گیا اور مفید مشورے ہوئے۔

منصوبہ سازی:

۷؍جنوری ۲۰۱۰ء کانفرنس آفس سے مہمانوں کو فون کے ذریعے معلومات فراہم کی گئیں اور مزید اسکالرز کا انتخاب عمل میں آیا۔

شام میں عیسیٰ بابا نوری ماہم سے ملاقات کا وقت طے ہوا اور ان کے دولت کدہ پر نمائندہ افراد کی میٹنگ ہوئی، جس میں پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی اور کانفرنس و سیمنار کے یقینی اثرات سے آگاہ کیا گیا۔ سیمنار کی اہمیت و افادیت پر ڈاکٹر شمس نے صراحتاً روشنی ڈالی، آپ کی باتوں سے متاثر ہوکر ایک صاحب عبدالکریم بھائی نے مالی تعاون سے نوازا، اس کے بعد میٹنگ کا اختتام ہوا اور پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کا عیسیٰ بابا نوری نے یقین دلایا اور دو روز کا وقت مانگا، دو دن کے بعد نوری بابا کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان کا وعدہ محض وعدہ ہی رہا۔

۸؍جنوری جمعہ کا دن تھا، کانفرنس آفس میں جمع ہوکر منصوبہ سازی کی گئی، ہینڈ بل، پوسٹر کی اشاعت سے متعلق منصوبہ بندی کی گئی، کیوں کہ مقام کانفرنس کا تعین کیا جا چکا تھا۔

اشرف الصوفیہ سے ملاقات:

عشا کے بعد تھانہ میں ایک کارنر میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جہاں اشرف الصوفیہ سید محمد اشرف صاحب ایک اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے اور مفتی زبیر مصباحی مقرر خصوصی تھے، کرسی صدارت پر جلوہ بار ہونے سے قبل اشرف الصوفیہ نے کانفرنس کے اراکین کو بلایا اور مشوروں کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی کامیابی کے لیے دعاؤں سے نوازا، اتنا ہی نہیں سرگرم نوجوانوں کی ٹیم بھی فراہم کی، جو تھانہ اور اطراف میں کام کے لیے تیار ہوگئے۔

اشرف الصوفیہ نے کانفرنس میں اپنا رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ طویل ملاقات کے بعد جلسہ میں شرکت کی، جہاں مفتی زبیر صاحب سواد اعظم کی حقانیت پر مدلل گفتگو فرما رہے تھے، آپ کے خطاب کے بعد ڈاکٹر غلام جابر نے اظہار خیال فرمایا، امام احمد رضا کی ہمہ جہت شخصیت کا تعارف تاریخی تناظر میں محققانہ انداز میں پیش فرمایا، خصوصاً دانش گاہوں سے مربوط طلبا کو مخاطب فرما کر امام احمد رضا کی سائنسی بصیرت پر روشنی ڈالی، امام کے معاصر سائنس دانوں پر امام کی فوقیت ثابت کی، تاریخی دلائل سے امام احمد رضا پر لگائے جانے والے الزامات کی قلعی کھول دی، فرمایا کہ جب تقویۃ الایمان لکھی گئی، اہانت رسالت کا ارتکاب کیا گیا، تو سب سے پہلے اس کا رد علامہ فضل حق خیر آبادی نے ''تحقیق الفتویٰ'' کے نام سے فرمایا، اسی وقت سے رد لکھا گیا، اس کے کم و بیش ۳۶؍برسوں کے بعد امام احمد رضا نے وہابیت کا علمی

تعاقب فرمایا، اور حکم شرع واضح کیا، تعجب کی بات ہے کہ اعلیٰ حضرت سے ۳۶ رسال پہلے جنھوں نے رد کیا، جیسے علمائے بدایوں، علمائے دہلی وخیر آباد وغیرہ ان پر طعنے نہیں کسے جاتے، جتنے اعلیٰ حضرت پر فرق ہائے باطلہ کی طرف سے کسے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ مکر وفریب کے تمام پردے علمائے حرمین کے حوالے سے امام احمد رضا نے چاک کر دیے اور باطل کو سر چھپانا مشکل ہوگیا، تب اتہام کا سہارا لیا گیا، آخر میں کانفرنس وسمینار کی افادیت پر علمی گفتگو کی اور خصوصاً طلبہ کو شرکت کی دعوت دی، سلام اور اشرف الصوفیہ کی دعا پر محفل کا اختتام ہوا، اور ڈاکٹر شمس اشرف الصوفیہ کے ہمراہ روانہ ہوگئے، جب کہ میں مفتی زبیر کے ساتھ کرلا کی طرف روانہ ہوا۔

علاقائی میٹنگوں کا انعقاد:

۱۰ رجنوری دفتری امور نمٹائے گئے، سمینار سے متعلق بعض اہم کام انجام دیے گئے، کچھ مقامی افراد سے میٹنگیں ہوئیں،

۱۱ رجنوری سمینار سے متعلق درکار وسائل پر غور کیا گیا۔

۱۵ رجنوری تک روزانہ ہی میٹنگوں کا انعقاد ہوتا اور لائحۂ عمل مرتب ہوتے، ۱۵ رجنوری کو کرلا ویسٹ کا مختصر دورہ کیا گیا اور جس میں بعض اہم افراد سے مل کر سمینار سے متعلق امور پر گفتگو کی گئی اور فنڈ کے ذرائع تلاش کیے گئے، حاجی سلیم، حاجی عبدالمجید، حاجی کلیم ودیگر افراد سے ملاقاتیں ہوئیں۔

۱۶ رجنوری کو گونڈی میں علمائے کرام کی ایک میٹنگ لی گئی، جس میں ۵۰ رکے لگ بھگ علما نے شرکت کی، کلیدی خطبہ مولانا نور محمد نعیم القادری نے ارشاد فرمایا، جب کہ پروگرام کے اغراض ومقاصد ڈاکٹر غلام جابر نے پیش کیے، حاضرین میں متعدد شخصیات سے ڈاکٹر شمس کی یہاں پہلی ملاقات رہی، سبھی کام سے متاثر تھے، حاضرین نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا، یہ میٹنگ اب تک کی تمام میٹنگوں میں سب سے زیادہ کامیاب اور مشوروں کے اعتبار سے بامقصد رہی، جس میں کثیر علما نے شرکت کی۔ جامعۃ العرفان کا ہال بھرا ہوا تھا۔ علامہ عبدالرحیم صاحب، علامہ محمود عالم رشیدی صاحب، علامہ عبدالحنان صاحب اور دیگر سبھی علمائے کرام نے بیداری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

۱۸ رجنوری کو جملہ امور پر غور وخوض ہوا، جوگیشوری دارالعلوم مخدومیہ میں میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس میں علاقائی علما نے شرکت کی، اور مفید تجاویز پیش ہوئیں۔

۱۹/جنوری کو اندھیری میں مولانا ناصر کے مکان پر نشست رہی وہاں سے مولانا ابرار عالم کے پاس اشتہاری اشیا کی فراہمی کے لیے روانگی ہوئی۔

۲۰/جنوری ممبرا میں بعد از عشا میٹنگ ہوئی، جس میں ممبرا اور اطراف کے علما و نوجوان شریک ہوئے، سماجی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

یہاں اراکین سمینار کا ارادہ میٹنگ کا تھا، لیکن ذمہ داران نے مسجد کا مائک آن کر دیا، جس کے سبب میٹنگ ایک جلسے میں تبدیل ہوگئی اور مختصر وقت میں عوام کی کثیر تعداد جمع ہوگئی، جس میں مولانا غفران صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیے، میٹنگ کا آغاز قاری محمد سلیم کی تلاوت قرآن سے ہوا، نعت شریف مولانا محمد اسلم برکاتی نے پیش فرمائی، تاثراتی خطبہ مولانا مفتی محمد توقیر صاحب نے دیا، جس میں آپ نے ڈاکٹر غلام جابر کی خدمات کو کھل کر سراہا اور ان کی تحقیقی بصیرت کے پیش نظر 'مفکر اسلام' کے خطاب سے نوازا اور پروگرام کو مکمل تائید سے نوازا۔

مرکزی خطاب ڈاکٹر شمس نے فرمایا۔ جس میں امام احمد رضا پر لگائے جانے والے الزامات کا تعاقب کیا، حق ظاہر کیا، سچائی اجاگر کی۔ معیار تعلیم کے حوالے سے اصلاحی نکات بیان کیے۔ فرمایا امام احمد رضا جملہ علوم وفنون پر کامل دست رس رکھتے تھے، سائنس و معاشیات، جغرافیہ و ہیئت کے حوالے سے علوم پر دلائل دیے، اور ایجوکیٹیڈ طبقے کے ذہنوں کو جھنجھوڑا، کہا کہ آپ کانفرنس میں امام احمد رضا کی خدمات پر وہ جلوے ملاحظہ فرمائیں گے جن سے نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔

انتظامی امور پر گفتگو:

۲۱/جنوری کو انتظامی امور سے متعلق کچھ معززین سے ملاقات طے ہوئی اور وقت متعین کیا گیا، بعد نماز مغرب محمد علی روڈ پہنچ کر ایک مخلص رحمت اللہ بھائی سے ملاقات کی گئی، آپ نے جملہ امور سے متعلق اپنی دل چسپی کا اظہار کیا اور تعاون کا یقین دلایا۔

ہم لوگ یہاں سے مینارہ مسجد کے امام وخطیب مولانا عبدالرشید رحمانی سے ملاقات کو گئے، راستے میں کئی افراد سے ملاقات رہی، جیسے نعیم روکڑیا، یوسف فروٹ والا، حاجی خلیل صاحب جنھوں نے وعدہ کیا کہ پروگرام میں ضرور آئیں گے۔ سبھوں نے حوصلہ افزائی کی، مولانا عبدالرشید صاحب نے پروگرام سے متعلق اپنی رائے دی اور مبارک باد بھی۔

امیر سنی دعوت اسلامی حضرت مولانا شاکر علی نوری صاحب سے ملاقات کا عزم تھا، جب آفس

گئے تو اطلاع ہوئی کہ حضرت اجمیر مقدس تشریف لے گئے ہیں، مولانا مظہر حسین علیمی کو دعوت نامہ سپرد کر کے رخصت ہو گئے۔

عزم و جرأت کا مظاہرہ:

۲۲، ۲۳ رجنوری کو بھی انتظامی امور نمٹائے گئے اور تیاری سے متعلق سرگرمیاں رہیں۔ یہ دو ماہ کا عرصہ ہماری جماعت کی بے حسی کی منھ بولتی تصویر میرے لیے ثابت ہوا۔ کہیں کہیں ایسے سلوک کا سامنا بھی ہوا کہ دل تڑپ اٹھتا، احساسات مجروح ہو جاتے، جذبات زخمی ہو جاتے، مگر جس جرأت و حوصلہ مندی کا مظاہرہ ڈاکٹر غلام جابر شمس نے کیا، وہ عزائم میں نئی جان ڈال جاتا، جسے میں مشعل راہ سمجھتا ہوں۔ وہ مجاہد سنیت ہیں، ان کے منصوبوں پر جماعت کے سرکردہ افراد کو سنجیدگی سے عمل کرنا چاہیے جس سے انقلاب کا سورج طلوع ہوگا، مگر ہماری جماعتی بے حسی کا کیا جائے، علمی کاموں سے کم ہی لوگ دل چسپی کا اظہار کر پاتے ہیں، یہ راہ بڑی دشوار لیکن کام کی ہے، جماعت کے مخیّر حضرات نام و نمود کے کاموں کو زیادہ فوقیت دیتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔ میرے استاذ نے ایسے ہی ایک صاحب خیر کو کہا تھا کہ آپ فلاں فلاں علمی کام کیوں نہیں انجام دیتے، اگر آپ بیدار ہیں، تو صرف سنیت کے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ عمل کے میدان میں اتر کے کام کرنا ہوگا۔

امید یا مایوسی:

۲۵ رجنوری ۲۰۱۰ء کانفرنس کے آفس میں ہی کچھ مقامی افراد سے مختلف وقتوں میں گفت و شنید ہوئی۔ جس نے مایوسیوں کے اندھیروں میں امید کی کرن کا کام کیا۔ بعد عصر ڈاکٹر شمس اور جمیل بھائی رکشہ والے بہ ذریعہ ٹیمپو راستوں کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے کوٹر گیٹ بھیونڈی پہنچے۔ جہاں بھیونڈی کے علما کی میٹنگ ہونا تھی، وقت بعد نماز عشا کا طے تھا، نماز عشا ادا کی، نماز بعد مایوسی ہی رہی یہ میٹنگ فلاپ رہی، کیوں کہ ۱۱ ربجے تک لوگوں نے تشریف تک لانا گوارہ نہ کیا۔ فون پر رابطہ کیا، سبھی نے یہی کہا کہ آرہے ہیں، مگر وقت گزرتا گیا۔ بہر حال مولانا محمد اسلم رضا، ڈاکٹر عمران وغیرہ نے حتی المقدور کوششیں کیں، یہ میٹنگ ہماری جماعت کی بے حسی کی مثال ثابت ہوئی، بعض نے اظہار خیال بھی کیا، ایک صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کا تعارف عصری اداروں تک نہیں کروا پائے اور نسلِ نواب تک غلط فہمی کا شکار ہے، آپ کے ایک پروگرام سے کیا یہ کمی پوری ہو جائے گی، خیر یہ تو مایوسی کی بولی تھی، ہم تھکے نہیں، مایوسی کا شکار نہیں ہوئے، امیدوں کے ہزاروں چراغ

روشن ہیں، امام احمد رضا کی ذات روشنی کا مینار ہے، جس کی روشنی پھیلائی جائے، تو دور ونزدیک منور ہو اٹھیں گے، دل کی دنیا میں انقلاب آجائے گا، ہم امیدوں کے ساتھ بڑھ رہے تھے، ہر رکاوٹ حوصلوں اور تجربوں کا سبب بن رہی تھی۔

ہمارا شکوہ ہے کہ لوگ کام نہیں کرتے، حقیقت یہ ہے کہ جو کام کرتے ہیں، ان کا ہم ساتھ نہیں دیتے، محاسبے کی ضرورت ہے، کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، ہم نے اگر یہی سوچ کر کہ ایک پروگرام سے کیا ہوگا، پیر پیچھے کرلیا، تو یہ بات مایوس کن ہوگی، لیکن ہم حوصلے کے ساتھ آگے بڑھے، تو کچھ نہ کچھ تلافی کا سامان ہوگا، بدگمانی کو دور ہونے کا موقع فراہم ہوگا، اندھیروں کو قائم رہنے دینا دانش مندی نہیں، روشنی کا سامان تو کرنا ہی چاہیے، ازالہ ہونا چاہیے، بے حوصلگی عقل مندی نہیں، حوصلوں کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔

میٹنگ میں بعض افراد نے شرکت کی مثلاً حافظ جمال صاحب، مولانا اسلم صاحب، مولانا اکرم رضا ،ڈاکٹر عمران رضوی اور دیگر حضرات، ہم ان کے عزائم کے قدرداں ہیں، خیر چند افراد کے مایوس کن تاثرات سے کیا ہوتا ہے۔ الحمدللہ! دلی سے کراچی تک اور ہند سے سندھ تک کانفرنس کے لیے ہزاروں زبانیں دعائیں دے رہی ہیں، لب آمین کہہ رہے ہیں، حوصلے چمک رہے ہیں، کامیابی قریب نظر آرہی ہے۔

موجود افراد کو ڈاکٹر صاحب نے پروگرام سے متعلق معلومات دی اور کام کے طریقے بتائے، نکات طے ہوئے، رات زیادہ ہوچکی تھی ہم لوٹ آئے۔ ادھر بھوک سے نڈھال تھے، شب دیر گئے کا وقت، کھانے کی تلاش۔ خیر یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور جان میں جان آئی۔

جماعتی کرب باعث حزن و ملال:

۲۶؍جنوری ۲۰۱۰ء...... گرچہ یہ جماعت حق ہے، ہمیشہ رہے گی، آگے بڑھے گی، لیکن سسک سسک کر، میں نے علامہ ارشد القادری اور علامہ مشتاق احمد نظامی کو جماعتی کرب میں دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا ہے۔ ہاتھ پیر چومنا آسان ہے، مگر قوم کی ترقی کے لیے علمی کام مشکل ہے، مشکل تر ہے، کوئی حوصلہ شکن مرحلہ سامنے آتا تو ڈاکٹر شمس کا عزم قابل دید ہوتا، اللہ کریم ان کے عزم و حوصلے کو قائم رکھے، تا کہ جماعت اہل سنت ان کے کارہائے نمایاں سے تا دیر مستفید ہوتی رہے۔

منزل کی طرف:

۲۸؍جنوری کو الحاج محمد سعید نوری، مولانا سید عبدالجلیل رضوی، مولانا سید سراج اظہر رضوی

اور عبدالعزیز بھائی سنی سے ملاقات طے ہوئی، اول الذکر سے ملاقات تو ہوئی لیکن مولانا سراج اظہر صاحب کو فوری کام سے کہیں جانا ہو گیا ان سے ملاقات نہ ہو سکی، تو ان کے صاحب زادہ مولانا سید منہاج سے ملاقات کی، جنھوں نے محبت سے ہمارا استقبال کیا۔ مہمان نوازی کی۔

۲۹ رجنوری کو جری مری کرلا میں ڈاکٹر سعید احسن قادری کے ذریعے پوسٹر اور جھنڈے وغیرہ پونہ پہنچائے گئے، جب کہ شام کو فاروق سوداگر درویش صاحب سے میٹنگ ہونی تھی، جس کے لیے ڈاکٹر شمس اور سلیم بھائی روانہ ہوئے۔

تیاریوں کے دوران کبھی کبھی ایسے لمحے آجاتے کہ آنکھیں پر نم ہو جاتیں، دل بجھ سا جاتا اور جب کبھی کوئی خوش خبری ملتی تو عزائم جواں ہو جاتے، جذبات بھڑک جاتے، حوصلے بڑھ جاتے، آج بھی کچھ یوں ہی ہوا۔ اور آج یہ خوش خبری ملی کہ امین ملت کی آمد یقینی ہے، پھر کیا تھا ہمارا پوسٹر جو اشاعت کو جا چکا تھا رکوا دیا گیا، کیوں کہ امین ملت اور تاج الشریعہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر شمس صاحب کئی ماہ سے کوشاں تھے، اور اسی سبب فائنل پوسٹر لیٹ کر دیا گیا تھا، خیر یہ تو خوش کن خبر تھی، امین ملت کی آمد کی اطلاع حوصلوں کو تازہ کر گئی، امین ملت نے عزائم کے طاق پر امیدوں کے چراغ روشن فرما دیے، پوسٹر میں امین ملت کی آمد کا اعلان شامل کر کے دوبارہ طباعت کو بھیج دیا، کیوں کہ کانفرنس کو اب ایک ہی ہفتہ باقی تھا، اور انتظامات بھی دیکھنے تھے۔

۳ رفروری کو مقامی افراد سے ملاقات کرنی تھی، شام میں جناب ابراہیم بھائی جان سے سانتا کروز میں ملاقات رہی، پروگرام کے سلسلے میں روز اول سے ہی نشیب و فراز آتے رہے، کوئی کم زور دل ہوتا تو حوصلہ ہار بیٹھتا، مگر ڈاکٹر غلام جابر شمس تو عزم محکم کا ہمالہ ثابت ہوئے، آگے ہی بڑھتے رہے، عزائم کی نئی تاریخ مرتب کرنی تھی، ایک نئی تاریخ لکھنی تھی، ناگفتہ بہ حالات میں ثابت قدم رہے۔

۴ رفروری کو انتظامی معاملات میں وقت گزرا، دشواریاں بھی حائل ہوئیں، ایسے مرحلے میں شفیق بھائی آئے، اپنے ذمہ کئی کام لیا، جس کے سبب پروگرام میں جیسا اسٹیج اور نشست چاہی تھی ویسا ہی ہوا۔

روشن صبح:

۷ رفروری کی صبح نمودار ہوئی، مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے، سمینار کا آغاز ہوا۔ اللہ اللہ! نور و نکہت کی بزم سجی، روحانی ماحول، کیف آگیں ماحول، دل کا عجب عالم، علم کا سماں، بات بریلی کے شاہ کی، ایمان افروز، علم و شعور و آگہی سے معمور سماں، اہل سنت کے اعلیٰ ذہن یک جا ہوئے، ملک کی نام وریونی

ورسٹیوں کے اساتذہ، دانش ور، ارباب قلم، محققین جمع ہوئے، مقالہ خوانی ہوئی، حسن انتظام نے مندوبین وشرکا کو متاثر کیا۔

چہار جانب اہل سنت کا اژدہام۔ رحمت باری جھوم کر برسی، ذکر رضا۔ فکر رضا۔ یاد رضا۔ خدمات رضا۔ اثرات رضا۔ اللہ اللہ! دل کا ہر تار ہم نوا ہو گیا۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے جب سمینار کے آغاز کے لیے علماومشائخ اور اسکالرز و دانش وران کی موجودگی میں حضرت شرف ملت سید محمد اشرف میاں مارہروی (معروف فکشن نگار وانکم ٹیکس کمشنر دہلی) نے پرچم کشائی کی اور سمینار شروع ہوا۔ تفصیلات رپورٹنگ میں دیکھیں اور تاثرات شاہدین سے لیں، تعمیر کا یہ سفر ہر لحہ بلندی کی جانب بڑھ رہا تھا، عقل و دانش کے سوتے پھوٹ رہے تھے، فیض رضا بٹ رہا تھا، فکر رضا کی آفاقیت کا اندازہ ہو رہا تھا، سچ ہے:

ہے مرے زیر نگیں ملک سخن تا بہ ابد　　میرے قبضہ میں اس خطہ کی چاروں سرحد

اپنے ہی ملک سے تعبیر ہے ملک سرمد　　ہے تصرف میں مرے کشورِ نعتِ احمد

ذہن وقلب پر خوش گوار اثر مرتب ہو رہے تھے، ڈاکٹر شمس کے عزائم کی فصل آج بار آور ہو رہی تھی، ان کے خلوص کا شجر پھل دار ہو چکا تھا، صحیح ہے:

تعمیر کی جانب صفت سیل رواں چل

وادی یہ ہماری ہے وہ گلشن بھی ہمارا

سمینار دو نشستوں پر مشتمل تھا، تمام مقالات کو بغور سنا گیا، تجاویز پیش ہوئیں، حضرت شرف ملت نے تاثرات دیے، اشرف الصوفیہ نے تاثرات دیے، سمینار کامیاب رہا، امام احمد رضا کے افکار، تعلیمات، تحریکات اور کارناموں سے قوم کو فیض یاب کرنے کی غرض سے کئی لائحۂ عمل مرتب ہوئے، تدابیر کی گئیں، ادبیات میں نگارشات رضا کی شمولیت کے لیے کارآمد گفتگو ہوئی، علمی مباحثہ ہوا، منصوبہ بندی کی گئی۔ اور سر شام سمینار، کانفرنس کی شکل اختیار کر گیا۔ وسیع میدان تنگ دامنی کا شکوہ کر رہا تھا، جوش و خروش کے ماحول میں کانفرنس کا انعقاد ہوا، سیکڑوں علما، دانش ور، اسکالرز، مشائخ تشریف فرما تھے، محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری صدارت فرما رہے تھے، امین ملت حضرت ڈاکٹر سید محمد امین میاں قبلہ سرپرستی فرما رہے تھے، امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب جلوہ بار تھے۔ کئی جلوے تھے، کئی نظارے تھے، دل کی کلیاں کھلی جا رہی تھیں، جذبات مچل رہے تھے، امیدوں کی فصل ہری ہو گئی تھی نخل تمنا بار آور تھی۔ علوم وفنون رضا کے کئی گوشے سامنے آئے، ہر گفتگو سنجیدہ فکر انگیز اور قوم وملت کے درد میں ڈوبی ہوئی۔

کیف آگیں لمحات گزر گئے، لیکن تاریخ میں اپنے گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ ممبئی کی سرزمین پر

میرا روڈ نے یہ اعزاز پایا کہ رضا کی عظمتوں کا ایک نیا باب کھلا، فکر کو روشنی ملی، جذبات کو توانائی ملی۔ ذکر رضا سے زبانیں تر ہو گئیں۔

۸؍جنوری کو غلام مصطفیٰ رضوی اور ڈاکٹر سید شمیم احمد منعمی کے ہم راہ کئی مقامات کا دورہ کیا گیا۔ پھول گلی میں مولانا سید سراج اظہر کے یہاں گئے، اور طلبا و اساتذہ کی موجودگی میں پروگرام ہوا۔ وہاں سے کیلکو گئے الحاج محمد سعید نوری صاحب، جناب محمد عارف رضوی سے ملاقاتیں رہیں، کانفرنس کا ذکر رہا، سمینار کی کامیابی کا ذکر رہا، تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں، ڈاکٹر غلام جابر شمس کی خدمات کا تذکرہ رہا۔

۹؍جنوری کا دن بھی مصروفیت میں گزرا، مندوبین میں کئی محققین کو رخصت کرنا تھا، کسی کو ائیر پورٹ کسی کو اسٹیشن پہنچانا تھا، سبھی علما و محققین نے سمینار و کانفرنس کی کامیابی پر دل کھول کر تاثرات دیے، دعائیں دیں، ڈاکٹر شمس کے حوصلوں کی ستائش کی، ان کے جذبات کی قدر کی، ان کی خدمات کا اعتراف کیا، قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کیا، حسن انتظام سے سبھی متاثر ہوئے، نظم وضبط کی سبھی نے ستائش کی۔ بہر حال کانفرنس و سمینار کا اختتام ہوا، لیکن یادوں کی دنیا آباد ہوگئی، اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، دلوں میں یادیں تازہ ہیں، محفل کی روحانیت اب بھی یاد آتی ہے، تو ایک کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ڈاکٹر غلام جابر شمس کے عزائم کو سدا جواں رکھے، وہ پھر ایسی کانفرنس کا انعقاد کریں، محققین کو جمع کریں، ذکر رضا سے گلشن کو مہکا دیں، دل کی کلیاں کھلا دیں، جذبات کو تازہ کر دیں، اللہ کریم ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

رپورٹ: غلام مصطفیٰ رضوی مالیگاؤں
Cell.09325028586

امام احمد رضا کی خدمات پر عالمی جامعات میں تحقیق ہو رہی ہے (ڈاکٹر سید امین میاں)

قومی سطح پر منعقدہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس میں علما و دانش وروں کی شرکت

ممبئی: امام احمد رضا کو شریعت کے ساتھ طریقت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ عالمی جامعات و یونی ورسٹیوں میں امام احمد رضا پر تحقیق و ریسرچ ہو رہی ہے۔ آپ کی ذات ایک لائٹ ہاؤس کی سی ہے جس سے دور و نزدیک روشنی پا رہے ہیں۔ آپ کا نام اہل حق کی علامت بن چکا ہے۔ امام احمد رضا ۲۱۰ رعلوم میں مہارت رکھتے تھے، جس پر ایک جامع کتاب جلد آ رہی ہے۔ امام احمد رضا ایک ولی کا نام تھا جس نے ۵۴ رسال تک اپنے قلم سے باطل کی سرکوبی کی۔ اعلیٰ حضرت کا مسلک مسلکِ غوث و خواجہ ہے، مسلک صاحب البرکات و مسلک مخدوم سمناں ہے۔ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ دینیات میں فتاویٰ رضویہ پڑھا جا رہا ہے، ان خیالات کا اظہار امین ملت پروفیسر ڈاکٹر سید محمد امین میاں مارہروی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے مرکز برکات رضا ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس میں کیا۔ ۷ رفروری کو قومی سطح پر میرا روڈ میں منعقدہ اس علمی اجلاس میں ملک بھر سے مشاہیر دانش وران، علما و مشائخ نے شرکت کی، ملکی و ملی مسائل پر امام احمد رضا کے افکار کی روشنی میں غور و فکر کیا گیا۔ امین ملت نے سمینار کے روح رواں امیر القلم ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی خدمات کی پذیرائی کی اور فرمایا۔ ڈاکٹر غلام جابر نے ایک تحریک کا کام کیا ہے۔ مجھے ان پر فخر ہے۔

صبح ۱۰ ربجے سمینار کا آغاز شرف ملت حضرت سید محمد اشرف مارہروی، انکم ٹیکس کمشنر دہلی نے پرچم کشائی سے فرمایا، ازیں قبل تلاوت و نعت خوانی بھی ہوئی۔ سمینار کی نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، گلبرگہ یونی ورسٹی نے انجام دیے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر منظر حسین، رانچی یونی ورسٹی نے بہ عنوان ''اعلیٰ حضرت بہ حیثیت مفکر'' پیش کیا۔ موصوف نے کہا: مولانا احمد رضا کی شخصیت ایسے ہشت

پہل ہیرے کی مانند ہے جس کا ہر پہلو درخشاں ہے۔ ان کے نزدیک وہی تصوف واقعی ہے جو شریعت کی پابندی رکھتا ہو۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر خواجہ اکرام، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دہلی نے ''نئی نسل اور فکر رضا کی ترسیل، اس کے مسائل اور امکانات'' کے زیر عنوان پیش کیا، موصوف نے علمی دنیا میں امام موصوف پر کام کے سلسلے میں چند سوالات قائم کیے اور تجاویز پیش کیں، موصوف نے کہا: انٹرنیٹ اور میڈیا سطح پر امام احمد رضا پہ کام کی ضرورت ہے، آپ کی کتابوں کو عام فہم انداز میں نئی نسل کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر شایع کر کے عام کیا جائے۔

تیسرا مقالہ پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد دکنی، گلبرگہ یونی ورسٹی نے پیش کیا۔ ''امام احمد رضا کا ایک ادبی افق'' کے عنوان سے تحریر کردہ مقالے میں انھوں نے کہا: یونی ورسٹیز و تعلیمی اداروں میں امام احمد رضا کو بہ حیثیت شاعر و ادیب متعارف کرانا وقت کی ضرورت ہے۔ آپ نے منطقی استدلال سے فن نعت گوئی اور ادب فہمی میں امام احمد رضا کی بصیرت پر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں کئی ایک مثالیں بھی ذکر کیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سراج احمد اجملی (شعبۂ اردو) نے ''کمالات رضا کے اعتراف کی صورتیں'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، موصوف نے علمی انداز میں گفتگو کی اور فرمایا: امام احمد رضا کی سائنسی بصیرت سے عوام کو واقف کرانا چاہیے، انگریزی میں آپ کی تحریریں شائع کر کے انھیں دنیا بھر میں عام کیا جائے۔ ان کا تعارف دانش ور حلقوں میں کروایا جائے تا کہ اُمّت مسلمہ ان کی خدمات سے استفادہ کرے...... پانچویں مقالہ نگار تھے، پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی، شعبۂ اردو مظفر پور یونی ورسٹی بہار انھوں نے اپنے مقالہ ''امام احمد رضا کا اسلوب تنقید اردو ادبیات کے حوالے سے'' میں کہا: ادبی خدمات میں بلند منصب پر فائز ایسی جامع شخصیت دور دور تک نظر نہیں آتی۔

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

سمینار کا چھٹا مقالہ بہ عنوان ''امام احمد رضا اور طب یونانی'' ڈاکٹر سعید احسن قادری، یونانی میڈیکل کالج پونے نے پیش کیا، موصوف نے اپنے اس اچھوتے مقالے میں تحریر کیا: آپ نے ضرورت کے تحت طب کے موضوع پر حذاقت کے جلوے دکھائے، لغت و تلفظ ادویہ پر امام کو دسترس حاصل تھی۔ آپ کی طبی بصیرت علم طب کے لیے باعث فخر ہے۔

ساتواں مقالہ ''اعلیٰ حضرت – مجدد علم معاشیات'' پروفیسر عبد المجید صدیقی، سابق پرنسپل سٹی کالج مالیگاؤں نے پیش کیا، موصوف نے ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی صورت حال پر گفتگو کی، سچر کمیٹی

کی رو سے مسلمانوں کی معاشی میدان میں کم زوری کا حل امام احمد رضا کے معاشی نکات کے تناظر میں کیا۔ موصوف نے کہا: مسلم معیشت کے استحکام کے لیے امام احمد رضا کی تدابیر پر عمل ناگزیر ہے، آج دنیا کو سکون و عافیت کے لیے امام احمد رضا کے معاشی نظریات کو اپنا کر مسلم معیشت کے استحکام کی سمت تدریجاً بڑھنا چاہیے۔ ۱۹۱۲ء میں بلاسودی بینک کاری کا تصور امام احمد رضا نے دیا جس کی بنیاد پر معاشی نظریات بڑی تیزی سے دنیا پر اثر انداز ہوئے۔ اب بھی ان نظریات پر عمل کی ضرورت ہے۔

آٹھواں مقالہ ''امام احمد رضا کی اتحادِ اُمت کے لیے جدوجہد'' پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم منعمی، اورینٹل یونی ورسٹی پٹنہ نے پیش کیا، موصوف نے فرمایا: اتحادِ اُمت مسلمہ کا سب سے بڑا علم بردار امام احمد رضا ہے۔ آپ نے اسلامی روایات کو باقی رکھا۔ پٹنہ سے امام احمد رضا کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ امام احمد رضا کی کتابیں نصاب میں داخل کی جانی چاہئیں۔ معمولاتِ اسلامی پر کاربند بہار کی خانقاہیں فکر امام احمد رضا کے مطابق قائم کی گئیں۔ جہاں سے شریعت پر استقامت کا پیغام عام ہوا، اپنے مقالے میں موضوع سے متعلق مثالیں بھی واضح کیں۔ موصوف نے کئی جہتوں سے امام احمد رضا پر سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو کی، سمینار کی پہلی نشست کے اختتام پر دعائیہ کلمات حضرت سید شاہ محمد اشرف اشرفی الجیلانی نے ارشاد فرمائے اور کہا کہ: امام اہل سنت صادقین کے امام ہیں، ان کے مسلک پر استقامت میں نجات ہے۔ تاثرات حضرت سید محمد اشرف میاں مارہروی نے دیے، موصوف نے فرمایا: ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے پانی میں پتھر ڈال کر اضطراب پیدا کر دیا اور سمینار و کانفرنس کے انعقاد سے امام احمد رضا کی خدمات پر علمی کام کے نئے آفاق تلاش کیے ہیں۔

سمینار کی دوسری نشست کے مقالہ نگار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری اور ڈاکٹر امجد رضا امجد تھے، ہر دو نے امام احمد رضا کے اردو ادب پر احسانات، نثری و ادبی اثاثے، اور دقت نگاہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، امام کی علمیت کے اعتراف کے باوجود نصاب میں ان پر گوشے شامل نہ کرنا تعصب پر مبنی ہے، اردو ادب کے سرمائے میں امام احمد رضا کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ مفتی عبدالمنان کلیمی، جامعہ اکرم العلوم مرادآباد نے ''مسئلہ تکفیر اور امام احمد رضا'' کے عنوان پر استدلال سے بھرپور سنجیدہ گفتگو فرمائی۔ موصوف نے مسئلے کی نزاکت کو شرعی بنیادوں پر واضح کیا، امام احمد رضا کی تحقیق میں احتیاط اور شریعت کی پاس داری واضح کی،...... نماز مغرب کے بعد سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی، اٹھتے ہوئے سوالوں کے برجستہ و مدلل جوابات پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم منعمی نے دیے سنجیدہ اسلوب میں موصوف کے جوابات سے اہل علم محظوظ و مطمئن ہوئے۔

کانفرنس میں جب کہ ملک بھر کے علما و دانش ور اور مشائخ مسند نشیں تھے، امام احمد رضا کی سائنسی

بصیرت، قوت استدلال، علوم جدیدہ میں مہارت کے موضوع پر خواجۂ علم وفن خواجہ مظفر حسین رضوی، پورنیہ نے خطاب فرمایا جسے عوام وخواص سبھی نے یکسوئی کے ساتھ سنا۔ بعدۂ بارگاہ رضا میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے منقبت پیش کی۔ علامہ عبدالقادر علوی براؤں شریف نے خطاب فرمایا، موصوف نے کہا: امام احمد رضا عرب کے بھی امام تھے اور عجم کے بھی، آپ حق کی علامت کے طور پر جانے جاتے ہیں، چشم وچراغ خاندانِ برکات کا نام ہے امام احمد رضا، پہلے کالجوں میں امام احمد رضا کا تذکرہ باعث عار تھا اور آج ہر علم کی بزم امام احمد رضا کے ذکر کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ علمی انداز میں تعارف رضا کے لیے سنجیدہ قلم کار ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے سمینار و کانفرنس کے ذریعے نئے انداز میں کام کا آغاز کیا، میں ان کے خلوص کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ آپ نے امام احمد رضا کی عشق نبوی میں سرشاری پر علم الصرف وعلم النحو کے دلائل کی روشنی میں کئی ایک جلوے پیش کیے۔

دورانِ کانفرنس ایک شخص متاثر ہو کر امین ملت کے ہاتھوں داخلِ اسلام ہوا جس کا نام امین ملت ڈاکٹر سید امین میاں مارہروی نے محمد عبداللہ تجویز کیا۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے اس مبارک عمل کو فیض رضا قرار دیا کہ جس سے ایمان دلوں میں بس گیا۔

آخر میں خطبۂ صدارت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری نے ارشاد فرمایا، آپ کا موضوع امام احمد رضا کی محدثانہ وسائنسی بصیرت کے جلوے تھا، فرمایا: امام احمد رضا نے پانی کی رنگت پر تحقیق کی تو حدیث نبوی سے استدلال فرمایا۔ آپ تمام علوم کے ماہر تھے۔ آج حق اور دین حق کسی کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے تو وہ امام احمد رضا کی ذات ہے۔ آپ کا علم بارگاہ غوثیت کا عطا کردہ تھا، جو علم لدنی تھا، جس کی یہ شان کے قلم سے نکلے ہوئے کو کوئی چیلنج نہ کر سکا۔ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کا اہتمام کر کے مولانا غلام جابر شمس نے بہت بڑا قرض اتار دیا ہے۔...... کانفرنس کا اختتام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' اور امین ملت کی پرسوز دعا پر ہوا، اخیر میں علما دانشوروں اور مشائخ کرام نے اس طرح کی علمی نشست کے انعقاد پر مرکز برکات رضا کو مبارک باد پیش کی۔ اس تاریخی سمینار و کانفرنس میں ملک بھر سے ہزاروں اہل علم وارباب دانش نے شرکت کی اور امام احمد رضا کی دینی وعلمی خدمات پر سنجیدہ خطبات ومقالات کو سنا۔ مجموعی طور پر نظم وضبط لائق ستائش رہا، اور سمینار و کانفرنس امیدوں سے زیادہ کام یاب اور انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ جس کی علمی حیثیت یقیناً متاثر کن ہے اور اس کی آواز دور تک پھیلے گی، افکار رضا کی روشنی سے نگاہیں خیرہ ہوں گی اور اس بزم رضا کی خوش بو سے گلستانِ علم وادب مہک اٹھیں گے۔

غلام جابر شمس مصباحی

زمین بھر زحمتیں......فلک بھر فتح

تصور سے تکمیل تک: سر گزشتِ عزم و جزم

اس رات میں سویا نہیں، یہ ۴/۵/دسمبر ۲۰۰۹ء کی درمیانی رات تھی۔ رات کی سیاہی جب پھیلتی ہے تو حیات و کائنات کی ساری شئی اس میں ڈوب جاتی ہے۔ مگر اس شب تار کی چادر مجھ پر قابو نہ پا سکی، اور میں کسی تخیل کے پروں کبھی اڑتا رہا، کبھی دھڑام سے گرتا رہا۔ کبھی خود کلامی کرتا، کبھی خود فراموشی کرتا۔ کئی بار سوچا تو سہی، مگر وہ تخیل پیچھا نہیں چھوڑا۔ آنکھیں جلنے لگیں، تو پوری طاقت سے جھٹکنا چاہا، لیکن پھر وہی غالب رہا، میں مغلوب رہا، میری حرکت بھی ناکام رہی، اس تخیل کا ہر تار مجھے کستا گیا، جکڑتا گیا۔ بالآخر مرغ سحر نے بانگ لگائی، پھر مسجد کے بانگی نے 'الصلوٰۃ خیر من النوم' کہا۔ تب میں نے کہا، بھلے مجھ پر 'من النوم' تو صادق نہیں آتا چلو 'من الفراش' پر عمل کر ڈالوں۔ بستر سے اٹھا تو سہی، مگر لڑکھڑاتا ہوا، نماز پڑھا تو سہی، مگر جھومتا ہوا۔ کیوں کہ وہ کوئی شیریں سا تخیل تھا۔ یہ تخیل تھا امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کا، جس نے مجھے سونے نہیں دیا تھا۔ اس کی موہوم، نامعلوم، انجام سی لذت سے آنکھیں مخمور تھیں، دل مسرور تھا، ذہن کا ہر دریچہ معمور من النور تھا۔ پھر کیا ہوا، دن پر دن گزرتا گیا، رات پر رات بیتتی گئی، ہفتہ عشرہ گزر گیا اور میں اندر ہی اندر کبھی پھولتا، کبھی سکڑتا رہا۔ کیوں کہ ہر محبت کی ابتدا حسین تو ہوتی ہے، مگر انتہا انتہائی کربناک ہو جاتی ہے۔ اس دل ربا آغاز کا، دل خراش انجام سے میں دوچار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر پیشگی قابو پانا میرے بس میں تھا بھی تو نہیں۔

اس اجمال کی تھوڑی تفصیل یہ ہے۔ ۲۰۰۱ء کو میں کیرالا سے ممبئی منتقل ہوا، یہ فروری کا مہینہ تھا، تاریخ ۱۵/تھی، میرا روڈ میں قیام پذیر ہوا، کرایا کا مکان تھا، میں تنہا مکین تھا، کتابیں مونس تھیں، قلم غمخوار تھا، بجز اس کے کوئی یار تھا، نہ آشنا۔ تنہائی تھی، ذہن حاضر تھا، قرطاس و قلم سے خوب

دل بہلتا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں ایک جلسہ کیا، مناظر اعظم ہند مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے جم کر تقریر کی۔ ۲۰۰۶ء میں اس جلسے کا نام امام احمد رضا کانفرنس دیا۔ تاج الشریعہ مفتی اختر رضا ازہری میاں پہلی بار میرا روڈ تشریف لائے۔ مفتی محمود اختر قادری، ممبئی نے خاص خطاب کیا۔ ۲۰۰۷ء میں بھی مفتی محمود اختر صاحب تشریف لائے۔ ۲۰۰۸ء میں مفتی محمد ایوب مظہر پورنوی کا خصوصی خطاب ہوا۔ ۲۰۰۹ء میں حضرت علامہ ڈاکٹر حسن رضا پٹنہ کا بیان تھا۔ یہ سبھی پروگرام امام احمد رضا کانفرنس کے نام سے ہوئے۔ موضوع وہی امام احمد رضا کی ذات وخدمات رہا۔ ہر برس کا پروگرام پچھلے برس سے خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔ حوصلوں کو توانائی ملتی رہی۔

۲۰۱۰ء کا پروگرام دو حصوں پر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلا حصہ بنام سمینار، دوسرا حصہ عوامی اجلاس، سوچا تھا دو تین دانشور کو بلاؤں گا جو رضویات کی طاقتور ترجمانی کرسکیں۔ میرا روڈ میں اسمیتا کلب کے اے سی ہال، جس میں دو ڈھائی سو نشستوں کی گنجائش ہے، میں صبح کے وقت سمینار رہے گا۔ شام کے وقت شاہراہ پر اجلاس عام ہو جائے گا۔ جہاں ہر سال ہوتا ہے۔ مگر اس رات، جس کا ذکر اوپر ہوا اس پروگرام کا تخیل جو ذہن پر ابھرا۔ بڑا ہی جمبو جیٹ سائز ہیکل الوجود تھا۔ تصور کے آفاق پر جو نقشہ عیاں ہوتا تھا وہ بڑا ہی مسرت آگیں، ایمان افروز معلوم ہوتا اور جوں ہی سرمایہ کا سوچتا، غبارے سے ہوا نکل جاتی۔ اس ادھیڑ بن میں کئی روز وشب غلطاں و پیچاں رہا، مگر ہر صبح وشام وہ کوئی غیب سے آواز آتی، جو پکار کر کہتی، دریا بکھرا ہوا ہے، ڈرنا کیا ہے، تماشہ کیا دیکھتے ہو، چھلانگ لگا دو، تیرنا آجائے گا۔

آہنی عزم: وہ آواز کیا تھی جو غیب سے نمودار ہوتی، نس نس میں، انگ انگ میں آہنی عزم کی اسپریٹ بھر دیتی۔ تب تو میں ضبط نہ کرسکا، اگر ضبط کرنے کی کوشش کرتا، تو قریب تھا دل دماغ کی نسیں پھٹ جاتیں۔

اگلنا پڑا: جس شیرین نے خیال کے پچھلے کئی دنوں سے نیم جان، نیم مجنون کر دیا تھا، وہ مجھے اگلنا پڑا، یہ ۱۶/۱۷/ دسمبر کی تاریخ تھی۔ سب سے پہلے جس شخص کو بلایا، وہ جناب سعید علی عرف بابا جان تھے۔ پھر جناب پٹیل انجینئر اور جناب عارف بھائی کو بلایا۔ دل کی بات زبان پر لایا۔ تینوں نے 'ہاں' کہا۔ ساتھ نبھانے کا عہد و پیمان کیا۔ میں تو تھا ہی اب یہ تین آگئے، چار یار ہو گئے۔ جس نادیدہ، ناچشیدہ لذت سے میں سرشار تھا۔ یہ تینوں بھی سرشار ہو گئے۔ ایسا بڑا پروگرام، نہ کبھی دیکھا

تھا، نہ کرایا تھا، اس لیے میں تو الڑھ تھا ہی، وہ تینوں تو اور زیادہ الڑھ تھے۔

جذبۂ فرہاد: راہ دشوار تھی، نہ نشیب کا علم تھا، نہ فراز سے واقفیت تھی، شیرین اس پار تھی، بیچ میں آگ کا دریا تھا، کانٹوں کا پہاڑ تھا، یخ بستہ خون کی دیوار کھڑی تھی، دل میں فرہاد کا جذبہ جاگ چکا تھا، ہاتھ میں تیشۂ فرہاد تو نہیں تھا، سب سمند شوق پہ سوار تھے۔ دفعتاً ایڑ لگا دی، سمندِ شوق کے سُم سے دریا خشک، پہاڑ پاش پاش، دیوار مسمار ہو چکی تھی۔ دم کے دم میں ہم اس پار کھڑے تھے، مگر شیرین اب بھی ہماری دسترس سے باہر تھی، پھر غیب سے آواز آئی، سمندِ شوق کو زندہ چھوڑ دو، البتہ وہ کشتیاں جلا دو، جن سے پار اترا جا سکے۔

خوف ناک سناٹا: اب ہم تھے، سامنے خوفناک سناٹا تھا، مہی فضا تھی، اندھیر اور گھنگھور اس قدر تیز تھی کہ ایک پتہ بھی کھڑکے، تو کلیجہ منہ کو، جان ہتھیلی میں آ جاتی تھی۔ شیرین پاس تھی، مگر قابو سے باہر۔ اب ہم یاس و ناامیدی کے گھنے جنگل میں کھڑے تھے، مگر جلد ہی امید و فتح کی چاندنی میں نہا رہے تھے۔

بجلی کی کوند: بجلی کوندتی، راہ روشن ہو جاتی، ہم کچھ قدم آگے بڑھاتے۔ جگنو کی روشنی ہمارے لیے مینارۂ نور ثابت ہو جاتی۔ یوں ہم مسافت قطع کرتے۔ پھر تاریکی چھا جاتی، ہمارا قافلہ رک جاتا۔ نور و ظلمت، آس و یاس کی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ لیکن ہم بے سمت ہی سہی، سفر کرتے رہے۔

تشہیری مہم: بے یقینی کے جزیرے پر ہم تنہا تھے، ہر طرف ہو کا عالم تھا، بے حسی کی موت ہر سو رقصاں تھی، اسی ناچتی موت کے سامنے ہم نے زندگی کا اعلان کر دیا۔ یقین کی پوری قوت، اعتماد کی ساری طاقت کے ساتھ، تشہیری مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ ایک اردو میں، دوسرا انگلش میں، درمیانی سائز کے دو اشتہار بیک وقت شائع کر دیے گئے۔ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں یہ دس ہزار اشتہارات تھے۔ اسی اشتہار کی سائز گھٹا کر پمفلٹ بنائے گئے۔ یہ بھی اردو، انگلش میں دس ہزار تھے۔

ہلال محرم کی ہمراہی: ماہ محرم کا چاند نمودار ہو چکا تھا، ممبئی کے قلب و جوانب میں مجالس محرم کا جال پھیل چکا تھا، اس قسم کے اشتہار سے پہلی بار در و دیوار دمک رہے تھے، ہینڈ بل، پمفلٹ ہاتھوں ہاتھ تقسیم کیے جا رہے تھے۔ مجالس محرم کے کئی خطبا اس تاریخ ساز پروگرام کا اعلان

و اظہار بطیبِ خاطر کر رہے تھے۔ یوں یہ آواز ممبئی کے کونے کونے میں گونج رہی تھی۔ ہر گھر، ہر بچہ آگاہ ہو رہا تھا۔

آوازِ جرس کی آمد: تشہیری مہم کا یہ پہلا مرحلہ، جو اردو، انگریزی کے دو اشتہار، دو پمفلٹ پر مشتمل تھا، تاریخ و مقام کے تعین سے خالی تھا۔ ہر چند کہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ تاریخ و مقام کا اعلان بذریعہ اشتہار، اخبار، ہینڈ بل، بینر، پرچم عنقریب کیا جائے گا۔ تاہم لوگ بے صبری کا شکار ہو رہے تھے۔ شیدایانِ رضا، فدائیانِ رضا، عاشقانِ رضا فون کر کر کے ہمارے کانوں میں بانگِ جرس بجا رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے، یہ پروگرام کہاں ہوگا اور کب ہوگا، یہ آوازِ جرس جہاں ہمیں ڈسٹرب کرتی، اس لیے کہ ابھی ایک فون کی بات ختم نہیں ہوتی، کہ دوسرا فون آ دھمکتا۔ وہیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ سیمینار و کانفرنس کی صدا، صدا بصحرا نہیں، صدا بر گوش ثابت ہو رہی ہے۔ نئی بیداری، نیا انقلاب محسوس کیا جا رہا ہے۔

محرم کی مونسی: ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ حالات سے بے پروا ہو کر چار پمفلٹ پھر چھاپ دیے گئے۔ یہ بھی اردو اور انگریزی میں چھاپا گیا، جو تعداد میں دس ہزار تھے، آدھے سادہ، آدھے رنگین تھے، خرومو آرٹ پیپر پر چار کلر کی چھپائی سے یہ پمفلٹ انتہائی جاذبِ نظر، دلکش لگ رہے تھے۔ ماہِ محرم مونسی کر رہا تھا۔ دس روزہ مجالس محرم کے بعد جہاں جہاں خصوصی بیان ہو رہے تھے، وہاں وہاں یہ پمفلٹ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ منبروں سے اعلان بھی ہو رہا تھا، مسجدوں، مدرسوں، دفتروں، دکانوں، مکانوں، بسوں اور ٹرینوں میں بھی یہ پمفلٹ یا تو آویزاں کیا یا بانٹا جا رہا تھا۔ امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس کی خبر، اب اس آگ کی صورت اختیار کر چکی تھی، جو جنگل میں لگ کر آناً فاناً پھیل جاتی ہے یا جو پہاڑ کی چوٹی پر جلائی گئی، جس سے تمام آبادی روشن ہو جاتی ہے۔ وادی و کہسار کا ہر مسافر باخبر ہو جاتا ہے۔ تشہیری مہم کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔

نئے قافلوں کی شرکت: اب تک کی پبلسٹی، تشہیری کوششوں کا حاصل یہ ہوا کہ کچھ کچی عمر کے بچے، کچھ نوجوان، کچھ نئے کارکنان، کچھ نئے قافلے ہم سے آ ملے۔ جن سے کٹھنائیاں آسانیوں میں بدلنے لگیں اور وہ اپنے طریقوں سے، مگر ہمارے مشوروں سے اس کا ذکر آگے بڑھانے لگے، کچھ بچوں نے پمفلٹ تقسیم کیے۔ کچھ نوجوانوں نے اشتہارات اور پمفلٹ یہاں وہاں دور دراز مقامات پر بھجوائے اور چسپاں کروائے۔ کچھ جوانوں کا الگ الگ گروپ تیار کیا گیا،

کسی کو ایس۔ایم۔ایس۔کرانے کی ذمہ داری دی گئی۔ کسی کو ای میل کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بہت سے بچے اور نوجوان اپنے اپنے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں Mouth orgnisinhg، زبانی پرچار کرنے لگے، تجارت پیشہ اور پیشہ ورانہ کام کرنے والا نوجوانوں نے دکانوں، دفتروں، مارکیٹوں میں اس کا چرچا کیا۔ نئی نسل، نوجوان، طلبہ، دانشور طبقہ، پڑھا لکھا حلقہ اس پروگرام کا خاص حدف تھا۔ چنانچہ ہر شعبۂ زندگی تک یہ خبر پہنچانے کی ہر ممکن تدبیر اپنائی گئی۔ ممبئ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔ امام احمد رضا کے حوالے سے اس پیمانے پر اسی پروگرام کو آرگنائز کیا جارہا تھا، تاریخ ومقام کا اعلان دس ہزار پمفلیٹ، ہزاروں ایس ایم ایس، ہزاروں ای میل کے ذریعہ کیا جاچکا تھا۔

کش مکش کی گھاٹی: کوئی ایک درجن علما، ڈیڑھ درجن دانشور کی منظوری مل چکی تھی۔ حضرت سید محمد اشرف میاں انکم ٹیکس کمشنر دہلی، سیمینار کی صدارت اور افتتاح کی منظوری دے چکے تھے۔ محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ کانفرنس کی صدارت قبول کر چکے تھے۔ امام علم وفن خواجہ مظفر حسین رضوی شہ نشینی کا عہدہ تسلیم کر چکے تھے۔ یہ سب تھا، مگر ہم من ہی من میں کش مکش کی گھاٹی میں بھٹک رہے تھے۔ جس دن سے اس کاز کا آغاز ہوا تھا، اسی روز اول سے ہم کوشش میں تھے کہ اس انقلابی پروگرام کی سرپرستی، خانقاہِ مارہرہ یا بریلی شریف کی کوئی علمی بزرگ شخصیت کرے، اس کے لیے ہم برابر رابطے میں رہے۔ خواہش تھی کہ دونوں خانوادوں کی نمائندگی ہوجائے تو نورٌ علیٰ نور پھر ہم یوں نعرہ بلند کریں گے۔ آئے حضور، آنکھوں کا نور، دل کا سرور۔ لیکن یہ خواہش ہماری پوری نہ ہوسکی۔ امین ملت حضرت سید شاہ امین میاں مدظلہ نے تو کرم فرمادیا مگر ہزار کوششوں، ہر ہتھکنڈہ اپنانے کے باوجود، تاج الشریعہ، حضور ازہری میاں کو بلانے میں ہم کامیاب نہ ہوسکے۔

پبلی سٹی کا تیسرا مرحلہ: تشہیری مہم کا تیسرا مرحلہ بینر کی صورت میں تھا۔ ۵×۳ کا رنگین بینر دوسو کی تعداد میں بنایا گیا۔ آرٹسٹ کے آرٹ نے بے جان بینروں میں جان ڈال دی تھی۔ جاذب نظر، بولتے ہوئے بینرز کو ممبئ واطراف کی مساجد، مدارس، چوراہوں، شاہراہوں پہ آویزاں کیا گیا۔ اردو، انگریزی میں، یہ بینرز دیکھ کر شہر اور شہری اچھلنے لگے، فون کا تانتا بندھ گیا، مبارک بادیاں ملنے لگیں۔ لوگوں میں ایک سرور انگیز جوش ابھر چکا تھا۔ جس کا اظہار وہ فون اور مبارک باد کے ذریعہ کررہے تھے۔ اس لمحۂ لہر آمیز کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جس کے لیے یہ

اہتمام کیا جارہا تھا۔

ہلالِ عید کی نمود: ماہ صفر کا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہا تھا، بے قراریاں بڑھ رہی تھیں۔ ہر طرف جوش و جذبات کا ایک طوفان برپا تھا، گھڑیاں گن گن کر کٹ رہی تھیں، لوگ صبح درخشاں کی بہار دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے، کچھ وہ بھی تھے، جو اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے، جھلس رہے تھے، جل بھن کر خاک راکھ ہو رہے تھے۔ کچھ اپنے بھی تھے، جو سخت تمسے میں پیچ وتاب کھا رہے تھے، ان کی شہرت، ان کی بڑائی، شرمسار ہو رہی تھی۔ اپنا قافلہ مستانہ چال ڈھال سے، دھمال ڈالتا آگے بڑھتا جارہا تھا، نہ نوکیلی باتوں کا احساس تھا۔ نہ حقد، حسد کے کانٹوں کی چبھن کا ملال تھا، نہ ہی بے اعتنائی کی کڑھن، قافلہ کی رفتار روک پارہی تھی، سبا رفتار، سبک رفتار قافلہ، ہوا کے دوش پہ سوار تھا۔ جو آگے ہی آگے ہی پیش قدمی کرتے چلا جارہا تھا۔

پرچم رضا کی بہار: ۲×۳ فٹ کا پرچم رضا بنایا گیا، جو ایک ہزار کی تعداد میں تھا۔ سلک ساٹن، کپڑے کا یہ بینر چار کلر میں چھاپا گیا تھا، جس میں امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس، تاریخ، مقام، پرچم رضا لکھا گیا تھا۔ ایک طرف گنبد رضا جلوہ فگن تھا، دوسری طرف لکڑی ڈال کر سلائی کر دی گئی تھی، جب یہ پرچم ٹو یلر، فور ویلر گاڑیوں، چوراہوں، شاہراہوں، مسجدوں کے دروازوں، سڑکوں، گزرگاہوں پر آویزاں کیا گیا، تو پرچم رضا کی بہار اہلِ دل کے دلوں کو گدگدانے لگی، ہوا کے جھونکوں سے جب یہ پرچم لہرا رہے تھے، لوگوں کے دل ڈول رہے تھے۔ آنکھیں مخمور ہو رہی تھیں، لوگ بہار بردوش، مسرت بداماں، مست خرام، جوش و ترنگ میں بے خود ہوئے جارہے تھے۔

قریب سے قریب تر: ماہ صفر تیزی سے سفر کر رہا تھا، منزل قریب سے قریب تر ہو رہی تھی، شیرین تک پہنچنے میں دو چار قدم، یا دو چار ہاتھ رہ گئے تھے۔ جوش خود جوش زن تھا، جذبات سلگ کر انگار ہو رہے تھے، عزم و حوصلہ کی معراج ہونے کو چند ساعتیں باقی رہ گئی تھیں۔ امین ملت سید شاہ امین میاں مدظلہ سرپرستی کا پروانہ عطا فرما چکے تھے۔ راہ کے روڑے بھی کلیاں بن رہے تھے، سنگِ راہ بھی پھول ثابت ہو رہا تھا، قافلہ جو تازہ دم تھا، سرد و گرم کی شدت سے آزاد ہو چکا تھا۔

تشہیری مہم کا آخری مرحلہ: اس آخری مرحلے میں ہم نے دعوت نامہ شائع کیا، جو فل اسکیپ سائز موٹا آرٹ پیپر میں تھا، ایک جانب اردو، دوسری جانب انگریزی تھا۔ یہ بھی چار کلر میں چھاپا گیا، جس کی تعداد دس ہزار تھی، دعوت نامہ کا لفافہ اسی سائز کا تھا، جس میں گلاب کے پھولوں میں

گنبد رضا کو بسایا گیا تھا۔ جہاں جہاں یہ دعوت نامہ پہنچا، لوگ اس کی حسن کاری تزئین کاری، کے سحر سے مسحور ہو رہے تھے، بہتوں نے اسے فائل میں سجایا، بہتوں نے اسے فریم کرا کر یادگار بنا لیا۔ پروگرام کے بعد بھی کئی احباب نے فرمائش کی، ہمیں بھی دیجیے، ہم اسے بطور یادگار رکھیں گے۔

ہورڈنگ کا ہجوم: شیرین کی آمد آمد تھی، ہر طرح نہیں، سو سو طرح خیر مقدم کا سوچا جا رہا تھا، ۱۲×۸ کے سو، ۸×۴ کے سو، ہورڈنگز بنائے گئے۔ لکڑی سے فریم کرایا گیا، تب پھر چوراہوں، شاہراہوں، بس اسٹاپوں، ریلوے اسٹیشنوں، وغیرہ جیسے مسلم علاقوں کے نمایاں مقامات پر لگائے گئے۔ یہ بھی اردو، انگریزی زبان میں تھا۔

تشہیر کا انوکھا انداز: تین ۱۸×۳ کے پٹی نما بینر دو سو بنائے گئے۔ جو ممبئی کی ان لوکل بسوں کے دونوں سائڈ چپکائے گئے، جو بطور خاص مسلم علاقوں سے دن میں کئی بار گزرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ۱۰×۳ کے سو بینر اور بنائے گئے، جو ممبئی کے مسلم اکثریتی علاقوں کے ایک سو بس اسٹاپ کی پیشانی پر چپکائے گئے، یہ بھی اردو، انگریزی زبان میں تھا۔ ممبئی کیا، ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا قدم تھا، جو کسی دینی، علمی اجلاس کے لیے اس نئے ڈھب، نرالے ڈھنگ کا اہتمام کیا جا رہا تھا، لوگوں میں جوش و مسرت کا نیا نیا طوفان اٹھ رہا تھا۔

فائنل پوسٹر: تشہیری سرگرمیوں کے ہجوم میں، فائنل پوسٹر شائع کیا گیا، جو آرٹ پیپر رنگین چار کلر میں، پانچ ہزار کی تعداد میں تھا، ممبئی، اطراف ممبئی میں لگایا گیا۔ دسمبر ۲۰۰۹ء کے اخیر عشرہ سے یہ پرچاری مہم شروع ہوئی تھی، جو جنوری ۲۰۱۰ء کے اخیر ہفتے تک آ کر تھم گئی۔ ممبئی عظمیٰ اور اس کے قرب وجوار میں بیداری کی تازہ لہر، تازہ اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ کلیان، تھانے، بھیونڈی، پونہ، ناسک، مالیگاؤں، دھلیا، بھساول، جلگاؤں، عثمان آباد، شولاپور وغیرہ تک دعوت و تشہیر کا ڈورا دراز ہو چکا تھا۔ ہر جگہ جوش و خروش کا عالم دیدنی تھا۔ ہمیں جو رپورٹ مل رہی تھی اس سے معلوم ہو رہا تھا، انسانی سروں کا ایک چوطرفہ سیلاب ۷/ فروری ۲۰۱۰ء کو ممبئی کی طرف اُمڈتا چلا آئے گا۔ خود ممبئی میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔

کورنر میٹنگ کا انتظام: ایس ایم ایس، ای میل، ہینڈ بل، پمفلیٹ، بینر، پرچم رضا، پوسٹر، کٹ آوٹس، ہورڈنگ، خصوصی دعوت نامہ کے ذریعہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ تو ہو ہی رہا تھا، جگہ جگہ کورنر

میٹنگ بھی ہورہی تھی، جس میں متعلقہ علاقے کے علما، معززین، طلبہ، نوجوان، پڑھا لکھا طبقہ شرکت کرتا تھا۔ سمینار و کانفرنس کے مقاصد پر بھرپور روشنی ڈالی جاتی تھی، فکرِ رضا کے جلوے بکھیرے جاتے تھے، نادیدہ، ناشنیدہ گوشے دکھائے، سنائے جارہے تھے۔ جس سے شرکا وسامعین میں حرارت، اسپرپٹ، کرنٹ پیدا ہوجاتی تھی، شعوری طور پر ان کو یہ بات ضرور بتائی جاتی تھی، وہ اس پروگرام میں ضرور شریک ہوں، اپنی تعداد اور طاقت کا مظاہرہ ضرور کریں۔

اپنی آفس میں قید: اب کوئی ایک ہفتہ عشرہ رہ گیا تھا۔ تشہیری، ترسیلی، دعوتی سرگرمیاں، جو قریب ڈیڑھ مہینہ سے جاری تھیں، اب سمٹ رہی تھیں، میں اپنی آفس میں قید ہو چکا تھا۔ یہیں سے ساری فلڈ ٹنگ، آپریٹنگ کی جارہی تھی۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر، جو آفس سے چند قدم پر ہے کھانا کھانے تک نہیں جا پاتا تھا، ناشتہ کا تو پتہ نہیں، دوپہر کا کھانا شام کو، رات کا کھانا، سحری کے وقت کھایا جاتا تھا۔ آنے والے وفود، افراد کو اٹینڈ کرنا، فون ریسیو کرنا، کارکنان کو ڈائریکشن دینا مشکل ہورہا تھا۔ ناک پر دم تھا، مگر بحمد اللہ نماز اپنے وقت پر برابر ادا ہورہی تھی۔

گراؤنڈ میں خیمہ زن: اب تین چار دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ میرا روڈ کا سب سے بڑا گراؤنڈ، جہاں پروگرام ہونا تھا، مرتیا نگر کہلاتا ہے۔ جنوری کے مہینہ میں وہاں سرکس لگا ہوا تھا۔ جب اس نے جگہ خالی کی، تو میدان ناہمواری کا منظر پیش کررہا تھا، اس لیے پہلے اسے ہموار کیا گیا، پھر صفائی کی گئی۔ دو دن میں یہ کام پورا ہوا، تیسرے دن وہاں اپنے پروگرام کے لیے خیمہ، تمبو کا سامان ڈالا گیا، ممبر کی لمبائی چوڑائی، ۶۰×۴۰ تھی، ممبر کے تینوں طرف بیس فٹ جگہ چھوڑ کر ریلینگ لگائی گئی تھی۔ منبر کے پشت پر ۴۰×۲۰ کا بینر آویزاں کیا گیا تھا۔ مرکزی منڈپ ۳۰۰×۱۵۰ر کا تھا۔ خواتین کا منڈپ ۱۰۰×۵۰ کا تھا۔ نماز گاہ ۱۰۰×۵۰ کی تھی۔ مرکزی منڈپ سے کوئی چالیس فٹ چھوڑ کر، ۱۰×۱۰ کے دس اسٹال لگائے گئے تھے۔ مین انٹرنس کے قریب ریشپشن اور انفارمیشن کی کیبن بنائی گئی تھی۔ مین گیٹ نہایت شاندار اور اونچا بنایا گیا، جس پر پرچم رضا لہرا رہے تھے۔ منبر کے آس پاس کئی کولر لگائے گئے تھے۔ عام پنڈال میں سو پنکھے تھے۔ منبر کے پیچھے ۴۰×۲۰ کا منڈپ ضیافت کیلیے تھا۔ منبر کے دونوں بازو درخت نما دو جھومر نصب کیے گئے تھے۔ پوری ریلنگ میں تازہ پھولوں کے گلدستے سجائے گئے تھے۔ قریب پندرہ ہزار نشستوں کیلیے پندرہ ہزار کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ طہارت و وضو کا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ لائٹنگ سے پورا

میدان بقعۂ نور بن چکا تھا۔ ان انتظامات میں وقت یوں گزرا، جیسے پل جھپکتے ہی ہم نور و سرور کی دہلیز پر دستک دے رہے تھے۔ اس لیے ہمیں کئی روز و شب یہاں خیمہ زن رہنا پڑا۔

مندوبین کی تشریف آوری: ۶ر فروری کی شام ڈھلتے ڈھلتے، اکثر مندوبین کی آمد شروع ہو چکی تھی، اکثر مہمانان ہوائی جہاز سے اور کچھ ہی مندوبین ریل، مگر اے سی سے تشریف لا رہے تھے۔ اس لیے ایئرپوٹ اور اسٹیشنوں پر رضا کار فور ویلر گاڑیاں لے کر کھڑے تھے۔ مندوبین آتے گئے، گیسٹ ہاؤس میں ٹھہراتے گئے، جہاں پہلے ہی ڈبل بیڈ کے پندرہ اے سی کمرے بک کر لیے گئے تھے۔ کچھ مہمانان علی الصباح تشریف لائے۔

صبح بہاراں کا طلوع: وہ ۷ر فروری تھی، صبح بہاراں طلوع ہو چکی تھی، شیرین اب مکمل ہماری گرفت میں تھی۔ چند ہی لمحوں بعد اس کے رخ روشن کی تابشوں سے سورج کی شعائیں ماند پڑنے والی تھیں۔ اس کی زلفِ معنبر کی خوشبو سے سامعین وناظرین کی مشامِ جاں معطر ہونے والی تھی، ساڑھے نو بجے تک اہل علم، اہل قلم کا کارواں، ضروریات، چائے ناشتہ سے فارغ ہو کر تیار ہو چکا تھا۔ سامعین وناظرین کچھ بیٹھے تھے، کچھ اِدھر اُدھر خوشگوار حیرت سے تک رہے تھے، ٹھیک دس بجے مہمانوں کو لایا گیا، اشرفِ ملت سید محمد اشرف صاحب کے جلو میں سارے مہمانان تشریف لائے۔ جن کو مین گیٹ کے اندر، مرکزی منڈپ کے سامنے روک لیا گیا۔

رسمِ پرچم کشائی: یہ پرچم گرین ساٹن کپڑے کا بنایا گیا تھا، جو زری اور ایمیٹیشن کی تزئین کاری سے تیار کیا گیا تھا، یہ پرچم کسی نئی نویلی ماہِ لقا جیسی دلہن کا شادی جوڑا لگ رہا تھا، یہ مرکزی منڈپ کی پیشانی پر مانند تل عروسِ نو بہار کا جوبن دکھا رہا تھا، تمام مہمانوں کی موجودگی میں ہر مہمان ہاتھوں میں گلاب کا پھول لیے، گلاب کی پنکھڑیوں کی برسات میں اشرف ملت پرچم کشائی کی رسم ادا فرما رہے تھے۔ ادھر پرچم کشائی ہو رہی تھی، ادھر منبر پر مائک سے درج ذیل اشعار لحن داؤدی میں پڑھے جا رہے تھے۔ عجب رقت اور وجد کا سماں پیدا ہو چکا تھا۔ لگ رہا تھا۔ حور و غلمان جنت کی کیاریوں میں رقص کر رہے ہوں۔ ؎

وادی رضا کی کوہ ہمالہ رضا کا ہے
جس سمت دیکھئے وہ علاقہ رضا کا ہے

سمینار کا افتتاح: پرچم کشائی کے بعد تمام مہمانان خراماں خراماں منبر پر تشریف لائے۔ سفید چادر پہ سفید سفید مسندیں لگا کر جب یہ براق براق، زرق برق مہمانانِ گرامی، تشریف فرما ہوئے، تب نہایت طمانیت کے ساتھ کلام الٰہی کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ اشرفِ ملت سید محمد اشرف صاحب، جو سمینار کی صدارت فرما رہے تھے، انہی کی زبان حق نشان سے سمینار کا افتتاح ہوا، پھر مقالہ نگاروں کی باری آئی، جو شیرین کی زلف ورخ کا مختلف، متنوع، نئی نئی جہتوں سے مطالعہ، مشاہدہ کر کے، جو مقالے لکھ لائے تھے، ان کا اختصار خطابی انداز میں پیش کر رہے تھے۔ حاضرین، ناظرین، سامعین، شائقین، جو ڈیڑھ مہینہ سے بے تاب تھے، اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں، کھلے کھلے کانوں، سے دیکھ رہے تھے، سن رہے تھے، محظوظ ہو رہے تھے، جو جہاں بیٹھا، بیٹھا ہی رہ گیا، اٹھنے کا نام تک نہیں لیا۔ سب ہمہ تن گوش تھے، گوش بر آواز تھے۔ معلوم ہو رہا تھا، سروں پہ پرندے بیٹھے ہوں۔

سمینار کی نظامت: پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب، جو گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ شریف کے شعبۂ اردو و فارسی کے ہیڈ ہیں، اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین ہیں، سمینار کی نظامت کر رہے تھے۔ پروفیسر عبدالحمید صاحب رضویات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کو اس موضوع سے خصوصی شغف بھی ہے، یہ ان کا دانشوارنہ بڑاپن تھا، جو یہ فریضہ خوش دلی سے انجام دے رہے تھے۔

مجمع کا تقاضہ: بطور عام کسی بھی اجلاس میں ناظمِ اجلاس لوگوں کو بلاتا ہے، یہاں الٹی گنگا بہ رہی تھی، جب سمینار کی پہلی نشست، ڈیڑھ بجے دن ختم ہوئی، وادئ رضا میں آوازِ اذاں گونجی، نماز اور کھانے کا وقفہ رکھا گیا اور اعلان کیا گیا کہ سمینار کی دوسری نشست سہ پہر تین بجے شروع ہوگی، نماز کے بعد دو ہی بجے مجمع پھر سے جم گیا اور تقاضہ کیا کہ پروگرام پھر سے شروع کیا جائے۔ مہمانان کھانا ہی کھا رہے تھے۔ منتظمین حیرت میں تھے کہ کیا جائے، مجمع کے اصرار آمیز تقاضہ پر دوسری نشست فوراً شروع کر دی گئی۔ مجمع کی خواہش، تڑپ، شوق و ذوق واقعی حیران کن تھا۔

سوال وجواب کا سیشن: سمینار کی دوسری نشست دو بجے سے پانچ بجے عصر تک چلی۔ پھر اللہ اکبر کی صدائے دل نواز سے وادئ رضا گونج اٹھی، عصر کی نماز باجماعت پڑھی گئی، عصر تا مغرب سوال و جواب کا سیشن تھا۔ پڑھے گئے مقالات پر مجمع سے مختلف قسم کے اور کچھ خارجی تحریری سوالات بھی سامنے آئے، جن کے جوابات پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم احمد منعمی نے تشفی بخش دیے، سید

والا موصوف اور ینٹیئیل کالج پٹنہ کے صدر شعبۂ عربی ہیں، یہ سیشن کوئی ڈیڑھ گھنٹے چلا۔

اجلاسِ عام: مغرب کی اذان ونماز کے بعد اجلاس عام شروع ہوا۔ صبح جو مجمع تھا، دن چڑھتے اور سورج ڈھلتے کئی گنا بڑھ چکا تھا، شام ہوتے ہوتے، انسانی سروں کا وہ سیلاب اُمڈتا ہوا چلا آیا، جس کی توقع پندرہ دن پہلے سے کی جارہی تھی۔ یہ اجلاس رات گیارہ بجے تک چلتا رہا۔ جو ساڑھے گیارہ بجے، صلاۃ وسلام پر اختتام کو پہنچا۔ اس اجلاس عام کی صدارت، محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض حضرت مولانا نور محمد نعیم القادری نے انجام دیے۔ جب کہ صبح سے رات تک پورے پروگرام، پورے کانسپٹ، امین ملت سید شاہ امین میاں قادری برکاتی زید مجدہ کی نورانی عرفانی سرپرستی میں رواں دواں تھا۔ امام علم وفن خواجہ مظفر حسین رضوی کی شرکت نے پروگرام کی رونق دوبالا کردیا تھا۔

ہجوم وازدہام: ہجوم وازدہام کا یہ عالم تھا، کہ میدان لق ودق ہونے کے باوجود، اپنی تنگ دامانی کا شکوہ گزار تھا۔ علما، مشائخ، دانشوران کی وہ کثرت تھی کہ منبر اپنی خاص وسعت کے باوصف تنگیٔ داماں کا شکوہ کناں تھا۔ جلسہ گاہ سے ہٹ کر، پورے میرا روڈ میں چہل پہل کی آہٹ محسوس کی جارہی تھی۔ مسجدوں، مدرسوں، دکانوں، ہوٹلوں میں لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ روڈ، چوک، چوراہا، اٹا پڑا تھا۔

وی آئی پیز کا کراوڈ: باذوق عوام، دین دار لوگ، عقیدت کے مارے، محبت کے ڈسے افراد، اکابر، اصاغر، علما، ائمہ، دینی طلبا، دینی کارکنان، مذہبی مخلصین تو تھے ہی کہ ان کو پہلی بار ایسا دیکھنے سننے کو مل رہا تھا۔ لیکن وہ طبقہ جو کسی دینی مذہبی اجلاس میں شرکت نہیں کرتا، یا ایسے اجلاسوں میں ان کی دلچسپی کا سامان فراہم نہیں ہوتا، یہاں معاملہ ہی برعکس تھا، ان کی دلچسپی، ذوق وشوق کا بھرپور سامان موجود تھا۔ اس طبقہ نے اس پروگرام میں دلی چاہت سے شرکت کیا، اس کی شمولیت نے پروگرام کو بامقصد بنادیا تھا۔ اپنا ہدف بھی یہی تھا۔ کچہری، کورٹ، ہائی کورٹ کے ججیز، بیرسٹرز، پولس افسران، انسپکٹرز، ایجوکیشنل آفسران، انسپکٹرز، اسکولوں کے اسٹوڈنٹ، کالجیز، یونیورسٹیز کے طلبہ، کالجیز کے پرنسپلز، لکچررز، یونیورسٹیز ڈپارٹمنٹس کے ایچ اوڈیز، دیگر ریڈرس، پروفیسران، تعلیمی، سماجی، سیاسی، میدان سے جڑے ممتاز افراد، کئی ایم پی، کئی ایم ایل ایز، کارپوریشن کے کارپوریٹرز، دیگر عملہ، ہائی فائی بزنیس مین، کریم پیپل، تحریر وصحافت سے وابستہ سنجیدہ افراد، غرض

ہر شعبۂ زندگی کی نمائندہ شخصیات نے شرکت کی اور پہلی بار امام احمد رضا کی بے داغ ذات، بے غبار سیرت، بے نظیر مہارت علم وفن، بے بدل دینی ملی خدمات، بے جوڑ بصیرت وحذاقت، علمی، فکری، سیاسی، معاشی، طبی، سائنسی کارناموں کے بارے میں سنی، جس سے ان کے ذہنی آفاق صاف اور وسیع ہوئے۔ تمام حاضرین، ناظرین، سامعین، شائقین، نے وہ دیکھا، جو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ سنا، جو کبھی نہ سنا تھا۔ وہ پایا، جو کبھی نہ پایا تھا۔ جو بھی آیا، وہ یہاں سے سیر، سیراب، شاداب ہو کر اٹھا۔

اظہارات واعترافات: مندوبین، مساہمین، علما مشائخ، دانشوران میں سے جو بھی ڈائس، مائک پر آیا، سمینار وکانفرنس کی کیفیت، کمیت، مواد، تعداد، نظم ونسق، رنگ روغن، گیٹ اپ دیکھ کر، حیران وششدر کہنا تو مناسب نہیں، البتہ مسحور ومسرور ضرور ہوا۔ ہر ایک نے کھل کر اس بات کا اظہار واعتراف کیا کہ انہوں نے اپنی اپنی لائف میں بڑے بڑے پروگرامات دیکھے، مگر یہ پروگرام اپنی خصوصیت کے لحاظ سے ان کی لائف کا پہلا پروگرام تھا، اس کا اظہار خصوصیت کے ساتھ، امین میاں، اشرف میاں، خواجہ صاحب، محدث کبیر، علامہ علوی، اور تمام دانشوران اور پروفیسران نے کیا۔ پروگرام کے بانیان، رضا کاران کو داد وتحسین، دعاؤں سے نوازا۔ آئندہ بھی ان سے نیک خواہشات کا اظہار فرمایا۔

اثرات ونتائج: کام کرنا آسان ہے، کام کا اثر پیدا کرنا مشکل ہے۔ گائے پالیں، دودھ نہ دے۔ درخت لگائیں، پھل نہ ملے، تو کیا فائدہ؟ جشن منانا، جلوس نکالنا، کانفرنس بلانا، مقصدی، افادی ہو، تو ٹھیک ہی نہیں، ضروری بھی ہے۔ اگر وہ مقصدیت، افادیت، نافعیت سے خالی ہو، تو کوئی کچھ کہے، میرے نزدیک ضیاع وقت، ضیاع مال دونوں ہے۔ امام احمد رضا سمینار وکانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب ہی نہیں، حد درجہ کامیاب، تاریخ ساز بھی رہا۔ ہر طرف نئی بیداری، نیا انقلاب ثابت ہوا۔ غیروں کا ذہن صاف ہوا۔ اپنوں کا حوصلہ بڑھا۔ جماعت کا وقار بلند ہوا، جو لوگ کنفیوزن، ڈپریشن کے گھیرے، دائرے میں تھے، وہ ان گھیروں، دائروں سے باہر نکل آئے۔ نوجوانوں میں کام کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ پورے مہاراشٹرا میں اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ پورے ملک میں اس پروگرام کو تحسین وتوقیر کی نظر سے دیکھا گیا، آج بھی وہ لوگ اسے یاد کر رہے ہیں، جنہوں نے شرکت کی، دیکھا، سنا، اور وہ لوگ پچھتا رہے ہیں، کف افسوس مل رہے ہیں، جنہوں نے نہ تو شرکت کی، نہ دیکھ پائے، نہ

سن پائے۔ہاں دوسروں کی زبانی سن کر سر دھن رہے ہیں۔

کچھ محسنوں کا ذکر: یہ پروگرام جس کی لذت سے آج بھی لوگ سرشار ہیں، پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں، انگاروں کا لق ودق صحرا، عبور کر کے انجام دیا گیا، یہاں کچھ ذکر مخلص محسنین کرام کا۔

امین ملت کی عنایتیں: امین ملت سید شاہ امین قبلہ کو اطلاع مل چکی تھی، یہ پروگرام منفرد نوعیت کا منعقد کیا جارہا ہے۔ان کی دعائیں برابر مل رہی تھیں، جب ان سے عرض کیا گیا، سرپرستی آپ کی ہوگی، منظوری کا پروانہ عطا فرمادیں۔اول اول تو ان کا نظام الاوقات اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس تاریخ کو ممبئی تشریف لائیں اور پروگرام کی سرپرستی فرمائیں، مگر جب پروگرام کی تیاریاں جنگی پیمانے پر شروع ہوئیں، جن کی ان کو صبح، شام پل پل آگاہی ہورہی تھی، بالآخر نظام الاوقات پر قابو پالیا گیا اور سرپرستی قبول فرمالی گئی۔پھر تو امین ملت نے وہ رول ادا کیا، جو کسی مقتدر پیشوا سے امید ہوسکتی ہے۔مارہرہ، علی گڈھ ہوتے ہوئے بھی، اپنی دعاؤں، اپنی عنایتوں سے نوازتے رہے۔خبر گیری کے ساتھ ساتھ رہنمائی فرماتے رہے۔

اشرف میاں کی دلچسپی: امین ملت کی طرح اشرف میاں کو بھی اول روز ہی سے خبر تھی، بلکہ اس سے پہلے بھی مشورہ لیا تھا، از راہِ کرم پہلے انہوں نے سمینار کی صدارت کی منظوری دے دی تھی، جو سمینار کمیٹی کی اولین ترجیح تھی، کیوں کہ اس منصب کی شہ نشینی ان ہی کو زیبا تھی، اشرف میاں نے اس منصب کی لاج ہی نہیں رکھی، بلکہ اس کے وقار کو اور بڑھادیا،عین وقت پر جو صدارتی ذمہ داری تھی، وہ تو نبھائی ہی۔دہلی رہتے ہوئے بھی اس منصب کا حق ادا کررہے تھے۔ہمیں برابر گائیڈ کررہے تھے۔پروگرام کی نقل وحرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

کرم بالائے کرم: امام احمد رضا نے کہا تھا:

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں۔دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

سید امین میاں، سید اشرف میاں، اسی خانوادۂ خاص کے چشم وچراغ ہیں، مخدوم ابن مخدوم، سخی ابن سخی ہیں، پروگرام کی مالیاتی کشتی بھنور میں ہچکولے کھارہی تھی، عین موقع پر دستِ سخا بڑھادیا، کشتی پار اتر گئی۔

ع: خود بھیک دیں اور کہیں منگتا کا بھلا ہو

یہ منصب تو انہی کا ہے، پھر کس کو زیب دے سکتا ہے۔

دو دیوانے اور: الحاج محمد فاروق سوداگر صاحب، تاجر ہیں مگر دین دار ہیں۔ دینی درد رکھتے ہیں، دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ الحاج محمد ابراہیم عرف بھائی جان، یہاں کی مشہور شخصیت ہیں۔ آل انڈیا حج کمیٹی کے منبر ہیں۔ آل مہاراشٹرا جماعت رضائے مصطفیٰ کے صدر ہیں۔ سیاسی، سماجی، کاموں میں الجھے رہتے ہیں، مگر دینی دلچسپی کا مظاہرہ کھل کر کرتے ہیں۔

جناب عارف نسیم: عارف نسیم سیاسی آدمی ہیں، مگر مذہب سے بے گانہ نہیں، وہ حکومت مہاراشٹرا کے وزیر ہیں، ہمیں انہوں نے پانچ منٹ کا وقت دیا تھا، مگر یہ ملاقات پون گھنٹہ تک طویل ہوگئی، اتنا وقت دینا ان کی دینی ہمدردی کا ثبوت ہے۔

کچھ خاموش خدمت گار: اس ضمن میں تو کئی شخصیات ہیں، جو نام کا اظہار نہیں چاہتیں، جناب شکیل صاحب، جناب اقبال صاحب، جناب زاہد صاحب، جناب نعیم صاحب کا نام اس امید سے لکھتا ہوں کہ وہ ناراض نہ ہوں گے، خدا ان سب کی خاموش خدمت کو قبول فرمائے۔

علمائے کرام کی قربانی: علما وائمہ کرام جو یہاں جماعت اہل سنت کے علمبردار ہیں، سب سے زیادہ دلچسپی، محبت، ایثار، قربانی ان کی ہے۔ ان کا ذکر لفظوں میں کرنا ایک رسمی بات ہوگی، حق یہ ہے، ممبئی کے علما وائمہ کرام اگر ہماری پشت پناہی نہ کرتے، تو یہ پروگرام لوگوں کی نم نم آنکھوں، بھیگے بھیگے دلوں میں، میٹھی میٹھی یادیں نقش کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوتا۔ ان علما وائمہ کی ایک لمبی فہرست ہے۔ سب اسماء درج کروں، تو ایک دفتر بن جائے گا۔ بعض کا کروں، بعض کا نہ کروں تو ناانصافی ہوگی، ترجیح بلا مرجح ہوگی۔ اس لیے بلا دغدغہ اعلان کرتا ہوں، اس تاریخ ساز پروگرام کی کامیابی کا سہرا ان ہی علما شیوخ، ائمہ کرام کے سر سجتا ہے۔ جنہوں نے اس کام کو اپنا کام سمجھا، ہر موڑ پر، ہر پل اس کا خیال رکھا۔

یارانِ جفاشعار: اس ضمن میں کچھ کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، مگر جی چاہتا ہے، چند جملے ہی سہی، یارانِ جفاشعار کی نذر کروں۔ تاکہ سند رہے، انہیں خلوص کی طاقت کا اندازہ نہیں، اگر ہوتا، جفاشعاری پر نہ اترتے، ان کی یہ جفاشعاری پھن پھیلائے ناگن تھی، جو ہمیں ہر پل، پگ ڈس رہی تھی۔ ہماری نس نس زہر آلود ہو رہی تھی۔ کرب واضطراب سے نان جو پر اکتفا کرنے والا، نیم جان ہو کر رہ جاتا تھا، پھر وہی خلوص یا جنون تریاق کا کام کرتا تھا، جس سے یارانِ زہرناک کی زہرناکی، یکسر دم توڑ کر بیٹھ جاتی تھی، فرہاد فرفراتا آگے نکل جاتا تھا۔ امام احمد رضا کے ان نادان دوستوں کی ہر رکاوٹ جو ہمارے سامنے سنگِ راہ نہیں، کہ اسے ایک

ٹھوکر میں اڑایا جاسکتا ہے، دیوارِ برلن بن کر کھڑی ہو جاتی تھی، پھر اسی خلوص کے قدم سے نہیں، کہ قدم تو دور کی بات ہے، قدم کی آہٹ سے ہی، زمین بوس ہو کر رہ جاتی تھی، اس لیے وہ یاد رکھیں، یہ اوچھی حرکت چھوڑ دیں، نادانی ترک کریں، دانائی کی راہ چلیں۔

آسمان سر پر: پروگرام کی ابتدا زیرو پوائنٹ سے ہوئی تھی۔ اس لیے پہلے پہل جیب خاص سے لگانا پڑا۔ بعد میں مالیات کی فراہمی ہونے لگی۔ درمیان میں کئی منزلیں ایسی آئیں، جب ڈس بیلنس ہو کر رہ گئے۔ ایک دفعہ بینر چھپ کر پڑا رہ گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد پیمنٹ کر کے اٹھا لائے۔ میرا سخت امتحان اس وقت ہوا۔ جب سمینار کو چار روز رہ گئے تھے۔ ایک گروپ نے پورے پنڈال کی سجاوٹ اپنے ذمہ لی تھی۔ جب پنڈال کا بجٹ دیکھا۔ ایک ثلث رقم دے کر ہاتھ اٹھالیا۔ مافی الید بھی کچھ نہیں تھا۔ ادھر ابھی اصل میدان کا رن اور رنگ دیکھنا، سر کرنا باقی تھا، اس سچویشن میں ہمارے احباب نے ہمیں مشورہ دیا۔ منڈپ و پنڈال کا حجم آدھا، مندوبین کی تعداد نصف سے کم کر دی جائے۔ ہم سنتے رہے، دل ڈوبتا رہا، ہماری پلکیں آبِ اشک سے وضو کرتی رہیں۔ جب دل ہلکا ہوا تو یوں گویا ہوا۔ عزم تو یہ تھا، شیرین کی ڈولی سونے کی چادر میں اٹھے گی۔ اب یہ کیا تک ہے۔ چڑی پہنا کر روانہ کر دی جائے۔ اس لیے نہ تو منڈپ ایک انچ کم ہوگا، نہ ایک مہمان روکا جائے گا۔ خدا پر کامل اعتماد ہے۔ وہ ہمیں ہرگز رسوا ہونے نہیں دے گا۔ غوث پاک مدد فرمائیں گے۔ فیضان رضا کی بارش: ہلی۔ بس آپ ساتھ رہئے، پھر خود اعتمادی، خود اعتمادی کا تماشہ دیکھئے، یہ گفتگو سن کر ہمارے احباب مایوسی کی کالی کوٹھری سے نکل کر یقین واعتماد کے اجالے میں آگئے۔

قیامت سر پر: اس وقت یہ قیامت سر پر آگئی جب سمینار کی پہلی نشست میں مقالے پڑھ سنا کر کچھ مہمانان رخصت ہو رہے تھے۔ ساڑھے چھ بجے ان کی فلائٹ تھی۔ ڈھائی تین بجے ان کو ہم الوداع کہہ رہے تھے۔ دو بجے تک ہمارے خزانچی کے پاس محض تیرہ ہزار آٹھ سو روپے تھے۔ ضرورت پچاس ساٹھ ہزار کی تھی۔ خدا گواہ، ڈھائی بجتے بجتے تحویل میں مطلوبہ رقم آگئی۔ خدا معلوم دینے والا کون تھا، لانے والا کون تھا۔ یوں ہی شام اور رات جو مہمانان روانہ ہو رہے تھے۔ حسب ضرورت رقم آتی گئی۔ ان کو رخصت کرتے گئے۔ اسی طرح ہم سمینار کے دوسرے، تیسرے، چوتھے روز تک مہمانوں کو رخصت کرتے رہے۔ پریس کا بل، منڈپ ڈیکوریٹر کا بل، گیٹ کا بل، چھوٹے اور بل سب چکا دیا گیا۔ کہیں کوئی مرحلہ ایسا نہیں، جہاں ہم پر ذلت یا رسوائی کا ہلکا سا بھی سایہ پڑتا، بخیر وخوبی پار گھاٹ اتر گئے۔ فالحمد للہ علی احسانہٖ، یہ رہی ہماری تصور سے تکمیل تک سرگزشت عزم وجزم۔

ہمیں کیا ملا: ہمیں روحانی مسرت ملی، ہماری اور ہمارے احباب سعید علی باباجان، سلیم بھائی، عارف بھائی کی روحیں اس مسرت سے جھوم رہی ہیں، ہم اسے توشۂ آخرت سمجھتے ہیں، ہم اسے اپنی زندگی کا ایک نہایت اہم دن قرار دیتے ہیں، خدا ہمیں ایسا دن بار بار دکھائے، ایسی خدمت کرنے کی توفیقات ارزانی فرمائے۔ قارئین کہیں، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

تجارت نہیں خدمت: تجارت کرنی ہے، تو بازار کھلے ہیں، مذہبی کام، جو بھی ہو، خدمت، سعادت سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔ تاجرانہ، پیشہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ یہ کام ان کی ذہنیت سے انجام دیا گیا۔ ہم نے یہ کام محض خدمت علم، اشاعت دین، سعادت اخروی سمجھ کر کیا ہے۔ رضائے مولیٰ اور رسول مولیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا ہے۔ رضوان من اللہ، خدا اور سول کی ادنیٰ سی خوشنودی کائنات کی تمام دولت سے بڑھ کر ہے، یہی چیز ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے۔

تاریخ وتذکرہ کی دنیامیں ایک روشن سویرا

کاملانِ پورنیہ

(جلد اول)

منظر عام پر آچکی ہے۔

جس میں چھٹی ہجری سے اب تک کے علما، صوفیا، شعرا کے حالات، خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم پورنیہ کے تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی، تعلیمی کوائف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: ۴۹۶ ۔ قیمت: ۲۵۰

تحقیق وتصنیف: ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

'وہ نوجوان، جو ہمارے خزینۂ لوح وقلم کا ایک تابدار موتی ہے۔ وہ آشنائے گل بھی ہے، ہمراز گل بھی ہے اور بلند بیں وبلند خیال بھی۔ جہاں وہ ایک مورخ کا عظیم فریضہ ادا کرتا ہے، وہیں سیرت نگاری کا بھی حق ادا کرتا ہے۔ وہ عزیز گرامی قدر ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی پورنوی ہیں۔ یہ انہیں کی بے پناہ جد وجہد اور مسلسل کاوش کا ثمرہ ہے۔' (مفتی حسن منظر قدیری کشن گنج)

آج ہی رابطہ کریں:

☆ برکات رضا فاؤنڈیشن میرا روڈ ممبئی

Dr. Ghulam Jabir Shams Misbahi
201- Gazala Galaxy, Nr. Karnal Shopping Centre,
Naya Nagar, Mira Road (E), Mumbai - 401107 INDIA
MOBILE : +91-98693 28511 / 96992 30776
E-mail: ghulamjabir@yahoo.com

اپیل

انجمن ثنائیہ دارالیتٰمیٰ میراروڈ شہر میں اہلسنت وجماعت کا منفرد ادارہ ہے جو قوم وملت کے مخیرّ حضرات کے تعاون سے اپنے تعلیمی سفر میں شب وروز عروج وترقی کے مراحل طئے کررہا ہے۔

فی الوقت ۱۵۰ طلباء مقامی وبیرونی دینی وعصری تعلیم سے آراستہ وپیراستہ ہورہے ہیں۔

انجمن کے زیرانتظام مندرجہ ذیل شعبہ جات جاری ہیں:

- محکمۂ شرعیہ سنی دارالافتاء والقضاء
- ثنائی کمپیوٹرایجوکیشن سینٹر
- انگلش سپیکنگ کلاسیز
- شعبۂ نشرواشاعت، انجمن ثنائیہ دارالیتٰمیٰ

اور بہت جلد انجمن کے زیرانتظام ایک سہ ماہی رسالہ بنام ''اہلسنت'' آپ حضرات کے پیش نظر ہوگا (انشاء اللہ)، جو مذہبی، مسلکی، ملی اور فلاحی مضامین پر مشتمل ہوگا۔

اس لئے قوم کے دردمند حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔

لا یضیع اجر المحسنین

ترجمہ: اللہ عزوجل محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔

(سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۲۰)

انجمن ثنائیہ دارالیتٰمیٰ، پوجانگر، میراروڈ، ضلع تھانے، مہاراشٹرا،

رابطہ: 022-28112026 / 09224455977

ANJUMAN SANAIYA DARUL YATAMA

Meera Road

MARKAZ BARKAAT-E-RAZA EDUCATIONAL TRUST (Regd.)